ہفت روزہ

ندائے خلافت

۸ر مارچ ۱۹۹۳

☆ جہان قدیم مسمار ہو رہا ہے' عالم نو پیدا ہو گا
☆ علماء کا درد ملی اور مسلم لیگ کی "سحر انگیزیاں"
☆ انقلابی عمل میں مزاحمت اور تصادم کے مراحل

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

مزاحمت و تصادم اور کشاکش و آویزش کائنات کا وہ عمومی قانون ہے جس سے گریز اور فرار کے راستے بالعموم منافقت تک لے جاتے ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور اللہ سے دعا کرے کہ وہ اسے حق کی نصرت اور حمایت میں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس راہ میں تا حین حیات استقامت اور بالآخر شہادت کی موت سے سرفراز کرے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کا خود اپنے بارے میں بھی یہ قول مبارک صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہوا ہے کہ "میری شدید خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں" (گویا آپؐ نے اللہ کی راہ میں چار بار قتل ہونے کی تمنا کا اظہار کیا)۔ آپ نے مسلمانوں کو متنبہ بھی فرمایا ہے کہ "جو مسلمان اس حال میں مرا کہ اس نے نہ کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کی آرزو دل میں رکھی ہو تو اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر ہو گی"

انقلابی عمل کے دوران مزاحمت اور تصادم کے جملہ مراحل کا کامل مرقع تو صرف سیرت النبیؐ میں نظر آتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کا استنباط بھی ہم آنحضورؐ کی سیرت مطہرہ سے ہی کر سکتے ہیں لیکن ہر مسلمان آپؐ کی ذات مبارکہ سے جس والہانہ عقیدت اور محبت کے رشتے میں بندھا ہوا ہے اس کے باعث بالعموم جب کوئی بات آپؐ کی ذات یا آپؐ کی حیات طیبہ کے حوالے سے بیان ہوتی ہے تو اس کے گرد عظمت اور تقدس کا اتنا روشن ہالہ بن جاتا ہے کہ نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نتیجتاً مدح و ستائش اور تعظیم و تقدیس کا جذبہ اتنی شدت سے ابھرتا ہے کہ اتباع کا جذبہ اس کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔ (تفکر و تذکر)

قیمت فی شمارہ ۵ روپے

مہندی اور شادی کی تقریبات میں شیطانی ہنگامے' یہ حشر آخر کیوں برپا ہے؟

صدا بصحرا

"کراچی سے محمد سمیع کی سینہ فگاریاں"

ایک معاصر روزنامے کی رپورٹ کے مطابق کراچی شہر کے متمول طبقے کے لوگ عموما سالگرہ' شادی بیاہ کی تقریبات پر کلبوں اور فلیٹوں میں رات رات بھر موسیقی کے پروگرام کی محفلیں سجاتے ہیں۔ موسیقی کے جدید ترین تیز آواز کے آلات کے باعث شہریوں کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ واضح رہے کہ موسیقی کے اعصاب شکن آلات نہ صرف بیماروں بلکہ عام لوگوں اور طالب علموں کے لئے بھی بے آرامی کا باعث بنتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تیز ترین آلات کی آواز کے شدید دباؤ سے انسانی صحت پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق کراچی کے نئے دولتمند خاندانوں میں سالگرہ' عقیقہ اور شادی بیاہ کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے اور ان تقریبات میں جھوٹی شان کے مظاہرے کے لئے موسیقی اور ورائٹی پروگراموں کا انعقاد ایک معمول بن گیا ہے۔ پروگرام رات بھر جاری رہتے ہیں جس کے نتیجے میں اہل محلہ کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔

اس میں میں دو باتوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ شورا شوری اور ہنگامہ صرف اہل ثروت اور نو دولتیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہم جیسے غریب لوگ بھی اس میں موجود ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اتنا شور شرابا نہیں ہوتا جتنا اب مہندی کی رسم کی ادائیگی پر ہو رہا ہے۔ موسیقی کا شور و غل' نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ناچ گانے' ان تقریبات میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تو رونا آتا ہے ان لوگوں پر۔ اگر اہل ثروت اور نودولتیے اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہیں تو بات پھر بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دولت کا انبار ہی لوگوں کی بے حسی میں اضافے کا سبب بن رہا ہے۔ اور کیوں نہ بنے کہ رشوت چور بازاری اور بلیک مارکیٹنگ کے ذریعہ کمائی گئی دولت کی "برکت" تو یہی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ غریب متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کی عقل کو کیا ہوگیا ہے۔

دوسری بات جو اس سے زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ رپورٹ میں زور "صحت پر مضر اثرات" پر ہی ڈالا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اور عظیم نقصان اخلاقی زوال کا ہے جو فحش گانوں اور فحش فلموں کے ذریعہ ہمارے معاشرہ کو پہنچ رہا ہے۔ اب کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب اخبار میں کسی خاتون کے ساتھ زیادتی کی خبر نہ آتی ہو۔ معاملہ تو گینگ ریپ تک پہنچ چکا ہے۔ ہماری غیرت کا جنازہ ایسا نکلا ہے کہ ہمیں کچھ بھائی نہیں دیتا۔ ایک طرف یورپ کے عیسائی اور ہندوستان کے ہندو مسلمان خواتین کی عزتوں سے کھیل رہے ہیں تو دوسری طرف ہمارے وطن میں انہی کی بنائی ہوئی عریاں فلموں نے لوگوں کے اخلاق کو اتنا گرادیا ہے کہ اپنی ہی ماؤں بیٹیوں اور بہنوں کی عزتوں سے کھیلا جارہا ہے۔ اور اس میں سرفہرست ہیں معاشرے میں اثر رسوخ رکھنے والے وڈیرے اور زمیندار اور قانون کے وہ نام نہاد محافظ' جنہیں عرف عام میں پولیس کہا جاتا ہے۔

اس پس منظر میں آیئے ذرا جائزہ لیں اس بیان کا جو وفاقی وزیر چودھری امیر حسین نے دیا ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں خواتین کی بے حرمتی کے اجتماعی واقعات پر حکومت کو صرف گہری تشویش ہے اور ایسے واقعات سے نمٹنے اور ان کی روک تھام کے لئے تمام صوبائی حکومتوں کو سخت اقدام کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس حوالے سے ان کے اختیارات میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔۔۔ حکومت کا کون سا ادارہ ہے جو اپنے اختیارات کو صحیح نہج پر استعمال کررہا ہے؟ اختیارات میں مزید اضافہ پتہ نہیں کیا رنگ لائے۔ کوئی ان وزیر صاحب سے پوچھے کہ جناب یہ ٹی وی کے جو رنگ ڈھنگ ہیں انہیں کون درست کرے گا؟ یہ جو ڈش انٹینا نے ناظرین کے لئے ٹی وی نیٹ ورک میں جو اضافہ کیا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ جو اخبارات میں عریانی و فاشی کو پھیلانے کا مقابلہ ہو رہا ہے اس کو کس کی اشیر باد حاصل ہے؟ کیا حکومت کا فرض نہیں ہے کہ انہیں لگام دے۔ یہ جو گلی گلی ویڈیو شاپس قائم ہیں اور جن کے ہفتوں سے قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنی جیبیں بھر کر فحش فلموں کی پکڑ دھکڑ سے اجتناب کررہے ہیں' اس کا کیا نتیجہ نکلے گا بلکہ نکل رہا ہے؟ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم مومنوں کو زمین پر تمکن عطا کرتے ہیں تو وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ یہ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت کیا کررہی ہے؟ اس کی قومی اسمبلی کے سپیکر صاحب غیر ملکی سفارت خانے میں غیر عورت کے ساتھ رقص کرنے میں کوئی خرابی نہیں سمجھتے اور اس کی امریکہ میں متعین سفیر صاحبہ صدر امریکہ کی حلف برادری کی تقریب میں ڈانس فرماتی ہیں تو کیا یہ سب عین قرآنی احکامات کے مطابق ہو رہا ہے؟ مزے کی بات یہ ہے کہ ان خاتون سفیر کی والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ وہ سفیر صاحبہ اتنی موٹی ہے کہ اس سے رقص ہو ہی نہیں سکتا۔ یعنی اگر وہ موٹی نہ ہوتی بلکہ سلم ہوتی تو اس کے ڈانس میں کوئی مضائقہ نہ ہوتا!!! ان کے شوہر صاحب بھی فرماتے ہیں کہ ماشاء اللہ ان کا وزن اور حجم اتنا ہے کہ رقص ممکن ہی نہیں۔ گویا کہ ان دونوں کے مطابق اگر ڈانس میں کوئی شے حائل ہے تو خاتون کا مٹاپا ہے نہ کہ خوف خدا۔ اور شوہر صاحب موصوف خوش قسمتی سے وفاقی وزیر تعلیم بھی ہیں۔ وہ تو اساتذہ کے لئے شاعر نے کہا تھا کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا۔
کار طفلاں تمام خواہد شد۔

وفاقی وزیر تو ملک کے تمام اساتذہ کا حاکم ہوتا ہے۔ ایسے میں ہماری معزز مہمان ملائشیا کے وزیراعظم کی اہلیہ نے پاکستانی حکمرانوں کو مشورہ دیا ہے کہ جس طرح ان کے ملک میں خواتین اور مرد حضرات ایک ساتھ مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں انہیں بھی چاہیے کہ یہاں اسی قسم کا طریقہ کار اپنائیں۔

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۲ شمارہ ۱۰

۸ر مارچ ۱۹۹۳ء

4

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

○

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

○

قیمت فی پرچہ: -/۵ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) -/۱۰۰ روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۸ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۰ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۱۲ " "

انتتاحیہ

نظام حکومت نہیں، نظام خلافت

ملک میں ان دنوں بحث کا موضوع بس آئندہ صدارتی انتخاب رہ گیا ہے اور اہل سیاست و صحافت دونوں اسی پر مشق سخن جاری رکھے ہوئے ہیں تو اس لئے کہ عنوان مندرجہ بالا کا اصل مضمون دستور کی آٹھویں ترمیم ہے ورنہ صدارتی انتخاب کا کیا ہے' چند سو اراکین اسمبلی کو گھیر گھار کر ادھر یا ادھر لے جانا بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انگلیوں پر گنے جاسکنے والے "چودھریوں" کو محلاتی سازشوں کے ذریعے رام کرلینا ہمارے شہسواران سیاست کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ فساد کی جڑ اور بس کی گانٹھ آٹھویں ترمیم میں مستور وہ صوابدیدی اختیار ہے جو شمشیر براں کی طرح منتخب وزیراعظم کے سر پر لٹکتی رہتی اور ملک کے علامتی آئینی سربراہ کو ہمارے حکومتی نظام کا "مائی باپ" بنا دیتی ہے۔ پھر پارلیمانی طرز حکومت کے پودے میں لگی ہوئی صدارتی نظام کی یہ قلم محض آرائشی پھول کھلانے کیلئے ہی نہیں بلکہ گزشتہ پانچ سال کے مختصر عرصے میں دوبار بیک جنبش وقت کی حکومتوں کے تخت کو تختہ کرکے دکھا بھی چکی ہے کیونکہ پھول کی اس پتی سے ہیرے کا جگر کٹ سکتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک بار پھر اس کی کارفرمائی کا مظاہرہ ہوتے ہوتے رہ گیا اور کہنے والے تو اب بھی بڑے اعتماد سے ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ "وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا" یعنی اسمبلیوں کو توڑنے والا وہ صوابدیدی اختیار بس استعمال ہوا کہ ہوا۔

آٹھویں ترمیم پر مکالے کا شور جتنا جتنا بلند ہوتا ہے اتنا اتنا قوی یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم آزادی و خودمختاری تہمت اٹھائے 45 سال سے زیادہ کا عرصہ گزارنے کے بعد بھی نظام حکومت کے استحکام کے اعتبار سے اب تک مکتب سیاست میں ابتدائی سبق لے رہے ہیں "یعنی یہی کہ رفت گیا اور بود تھا" اور حالت آج بھی یہ ہے کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں' اس فکر میں غنچے سوکھ گئے
آئین گلستاں کیا ہوگا' دستور بہاراں کیا ہو گا

جس ملک خداداد کو دور جدید میں قدیم اسلام کے آفاقی نظام عدل اجتماعی اور حریت و مساوات انسانی کی شاہکار مثال بننا تھا وہ نت نئے عطائی نسخوں کی تجربہ گاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں جس کا بس چلا' اس نے اپنی چلائی اور جس بندر کے ہاتھ ہلدی کی گانٹھ لگی وہ پنساری بن بیٹھا۔ آئین آئین اور دستور دستور کھیلتے ہوئے ہم نے دنیا میں رائج ہر طرز حکومت سے ٹھٹھا مخول کیا' "بے ہنگ" جمہوریت کا ناٹک بھی رچایا اور "بے کس" جمہوریت کی بے بسی کا تماشا بھی دکھایا لیکن کسی بھی انتظام پر سنجیدگی سے کام کرکے کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ برے سے برے نظام کو بھی سلیقے سے چلایا جائے تو دو دن بہار دکھا جاتا ہے جبکہ اچھے سے اچھا مجموعہ قواعد و ضوابط بھی بری طرح استعمال ہو تو ذرہ برابر خیر برآمد کرنے سے قاصر رہتا ہے اور کسی موزوں نظام حکومت کی تلاش میں ہماری اب تک کی تگ و تاز کی داستان کا سبق یہی ہے۔

ہم نے فرنگی آقاؤں کے ویسٹ منسٹر ٹائپ پارلیمانی نظام کو عطیہ خداوندی سمجھ کر حرز جان بنایا تھا جس میں اگرچہ "تاج برطانیہ" کن فیکون کے اختیار کا مالک ہے لیکن روایت پسندی کا عالم یہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ محض ایک علامت بنے رہنے پر قانع ہے۔ سب کچھ اس کے نام پر ہوتا ہے لیکن کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہیں عوام اپنے ووٹوں کے ذریعے پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں۔ بیسویں صدی کے اختتام تک آج بھی وہاں یہ ڈرامہ جوں کا توں سجتا ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ سے کسی بھی بل کو ایکٹ کی صورت میں پاس کروانے کے بعد قانون بنوانے کیلئے متعلقہ وزیر اذن باریابی لیکر ملکہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ملکہ کے شاہی دفتر میں پیش ہو کر مسودہ ان کے سامنے رکھتا اور دست بستہ کھڑے رہتے ہوئے ملکہ کی لب کشائی کا انتظار کرتا ہے جو کاغذات کی ورق گردانی کرکے زبان سے یہ الفاظ ادا کرتی ہیں کہ "منظوری عنایت کی جاتی ہے" اور مسودے کے مخصوص مقام پر دستخط ثبت کردیتی ہیں۔ پارلیمنٹ کے پاس کردہ کسی بل کو تاج برطانیہ کی طرف سے رد کیا جانا عملاً ناممکنات کے دائرے میں آتا ہے اور اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فرمان شاہی خود پارلیمنٹ کا بستر گول کردے لیکن اسی پارلیمانی طرز حکومت کی ہم نے پاکستان میں پیروڈی یوں کہ تاج برطانیہ کے نمائندے 'گورنر جنرل غلام محمد نے ہی وزیراعظم' اس کی حکومت اور خود پارلیمنٹ کو بلا کسی تقصیر کے گھر کا راستہ دکھادیا۔ یاد ہو گا کہ 23 مارچ 1956ء یعنی ملک کے پہلے دستور کے نفاذ سے پہلے ہماری حکومت کا آئینی سربراہ یعنی گورنر جنرل کم از کم نظری طور پر تاج برطانیہ کا نمائندہ ہی ہوا کرتا تھا۔

اور اب تو ہمارا نظام حکومت آدھا تیتر آدھا بٹیر ہے' بظاہر پارلیمانی لیکن بالقوۃ صدارتی کہ پارلیمانی سے صدارتی کی شکل اختیار کرنے میں اسے محض صدر مملکت کے انگلی اٹھانے تک کی دیر لگتی ہے۔ ہم نے اچھے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

الہدیٰ

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے ایمان والو' تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ یہ فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے'

(فرضیت صیام کا ذکر سورۃ البقرہ کے رکوع نمبر ۲۳ میں وارد ہوا ہے اور اس ایک رکوع میں روزے کی غرض و غایت' فضیلت ماہ صیام کی اصل بنیاد' روزے سے متعلق فقہی احکام اور روزے کا اصل حاصل' ان تمام مضامین کا کمال جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ اہل عرب کے لئے روزے کی عبادت اگرچہ غیر مانوس تھی لیکن سابقہ شریعتوں میں یہ عبادت کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ چنانچہ بطور ترغیب و تشویق روزے کی فرضیت کے حکم کے ساتھ ہی فرمادیا گیا کہ اے مسلمانو' تم پر کوئی انوکھی عبادت فرض نہیں کی جارہی' سابقہ رسولوں کی امتوں پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا تھا' اس عبادت کو تو ہمیشہ دین و شریعت کے مستقل جزو کی حیثیت حاصل رہی ہے)

تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو○

(روزے سے اصل مقصود تقویٰ کا حصول ہے۔ یہ ضبط نفس کی تربیت کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ روزے کی حالت میں ایک انسان اپنے آپ کو مرغوبات دنیا سے روک کر رکھتا ہے' وہ جرائم کے ارتکاب ہی سے باز نہیں رہتا بہت سی حلال چیزوں کے استعمال سے بھی رک جاتا ہے۔ گویا روزہ نفس کو کنٹرول میں لانے' اسے حرام خوری سے اور گناہ و معصیت میں ملوث ہونے سے رکے رہنے کی خو ڈالنے کا باعث بنتا ہے اور اسی کا نام تقویٰ ہے)

چند روز ہیں گنتی کے'

(کہ سال کے ۳۶۵ دنوں کے مقابلے میں انتیس یا تیس دن معدودے قلیل کے درجے میں آتے ہیں۔ لہٰذا ہمت کرو اور اس عظیم عبادت کے لئے خود کو پورے طور پر تیار کرو ---- یہاں ان مفسرین کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے جن کے نزدیک اس رکوع کی ابتدائی دو آیات کا تعلق رمضان کے روزے سے نہیں بلکہ اس ابتدائی حکم سے ہے جس کی رو سے ہر مہینے تین دن روزہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بعد میں جب رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت کا حکم آیا تو یہ پہلا حکم ساقط ہوگیا اور سال کا ایک مہینہ روزے کی عبادت کے لئے مخصوص ہوگیا)

تو جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے'

(روزہ دار کو یہ سہولت دی گئی ہے کہ وہ اگر بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو تو اسے اختیار ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔ لیکن بعد میں تعداد کا پورا کرنا ضروری ہوگا)

اور جو طاقت نہ رکھتے ہوں روزے کی ان کے ذمے بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا'

(یہ رعایت روزے کے ابتدائی حکم کے ساتھ تھی کہ اگر صحت و عافیت کے باوجود تم روزہ رکھنا نہ چاہو تو بطور بدل ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلادیا کرو ---- بعد میں یہ رعایت ختم کردی گئی)

تو جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو○

(کہ اگر زیادہ مساکین کو کھانا کھلاؤ یا دو وقت کی بجائے تین یا چار وقت کھانا کھلاؤ تو یہ تمہارے اجر و ثواب میں اضافے کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر تم سمجھ اور شعور رکھتے ہو تو جان لو کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے -- اس سے تقویٰ کی جو دولت تمہیں حاصل ہوگی اس کا متبادل اور کوئی چیز نہیں بن سکتی!)

(سورۃ البقرہ آیات ۱۸۳ اور ۱۸۴)

اللہ اپنے دین کی خدمت لینے کیلئے "موجودہ" مسلمانوں کا محتاج نہیں ہے

جہان قدیم مسمار ہو رہا ہے' عالم نو پیدا ہو گا

تاریخ کہاں جا رہی ہے

عصر حاضر میں ارادہ الٰہی کی کار فرمائی کا منظر

عبدالکریم عابد

انسانی تاریخ دو طرح کی ہے۔ ایک وہ جو انسان بناتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے اور فرعون' نمرود' شداد کی طرح سمجھتا ہے کہ یہ تاریخ ہمیشہ یونہی چلتی رہے گی۔ دوسری تاریخ وہ ہے جو ارادہ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے اور اچانک سب کچھ بدل کر رکھ دیتی ہے اور تمام ظاہری اسباب کے برعکس ایک نئے دور کا آغاز ہو جاتا ہے جس میں زبردست ذلیل انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ زیر دست اور کمزور عناصر لباس فاخرہ زیب تن کرتے ہیں۔ تاریخ کا یہ تغیر و تبدل ہم نے اپنے دور میں کچھ زیادہ ہی دیکھا ہے۔

برطانیہ' فرانس' اٹلی' بلجیم' ہالینڈ' پرتگال کے سامراج ہمارے دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے۔ غلام قوموں کو آزادی مل گئی اور یہ خیر عالمی جنگ کے شر سے پیدا ہوا تھا جس نے سامراجی طاقتوں کا بھرکس نکال دیا تھا۔ انہوں نے ہٹلر اور مسولینی کے مقابلہ میں فتح حاصل کی مگر حصول فتح کے لئے سب کچھ کھو دیا۔ اس فتح کا ماحصل یہ تھا کہ امریکہ طاقتور ہو گیا اور اس طاقتور امریکہ کا یورپ کے دیوالیہ ملکوں سے مطالبہ تھا کہ اپنی نو آبادیاں کو آزاد کرو تاکہ ہم ان ملکوں پر اپنا سیاسی اور اقتصادی غلبہ قائم کر سکیں۔ یورپی ملکوں کو ڈالر کی ضرورت تھی اور ایسی شدید ضرورت کہ وہ امریکہ کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار تھے۔ ان کی اقتصادی محتاجی ہمارے لئے آزادی کی نوید ثابت ہوئی۔ اگر امریکی دباؤ نہ ہوتا تو سامراجی اپنے محکوم ملکوں پر جاگیرداروں' سرداروں' افسروں' تاجروں اور پولیس کی مشینری کے ذریعہ مزید حکومت کر سکتے تھے۔ فوج کے استعمال کی ضرورت بھی انہیں کبھی کبھار تھی لیکن امریکی حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ انگریز کے وفادار اور خان بہادر طبقہ نے بہت شور مچایا کہ آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں' بد تمیز کالے آقا ہمارے سر پر مسلط کر رہے ہیں۔ یورپ میں بھی کہا گیا کہ آزادی کا سورج ان ملکوں کے لئے بربادیوں کا پیغام لائے گا۔ ابھی ترقی یافتہ یورپ کو غیر مہذب علاقوں کو آزادی دینے کے معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن امریکہ ڈنڈا لے کر سر پر کھڑا تھا کہ ڈالر چاہیے تو آزادی دو اور سب کو امریکہ کی بات ماننی پڑی۔ نہ مانتے تو امریکہ یہ ڈالر یورپ کی تعمیر نو کی بجائے ایشیا' افریقہ میں بغاوتیں پھیلانے کے لئے بھی دے سکتا تھا اور امریکی شہ ہوتی تو یورپی ملکوں کے لئے حکومت کرنا مہنگا سودا ہوتا۔

گویا عالمی جنگ نے جہاں یورپ کو برباد کیا وہاں ایشیا اور افریقہ کو آزاد کیا۔ یہ خدائی مشیت تھی جو ظہور پذیر ہوئی۔ اس کے لئے کہیں کسی انسانی گروہ نے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی نہ کسی کے حاشیہ خیال میں یہ آیا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت میں آفتاب غروب بھی ہو سکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے "غدر" کے بعد صورت حال دیکھئے۔ کانگریس نے بھی برطانوی دومینین میں رہ کر آزادی طلب کی تھی۔ آزادی ء کامل کا نصب العین کانگریس کا نہیں تھا' جمعیت العلمائے ہند کا تھا اور جب جمعیت کانگریس اتحاد کی بات آئی تو جمعیت نے شرط رکھی کہ کانگریس پہلے آزادی کامل کی قرار داد منظور کرلے اور مولانا حسرت موہانی نے یہ قرار داد پیش کی اور نہرو نے منظور کرائی۔ لیکن کافی عرصہ تک کانگریس برطانیہ کے زیر سایہ آزاد حکومت کی طالب تھی اور عام طور

پر سمجھا جاتا تھا کہ مقامی طور پر ذمہ دارانہ حکومت جو برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتی ہو وہ تو ممکن ہے لیکن مکمل آزادی ممکن نہیں۔ مگر یہ مکمل آزادی اچانک مل گئی۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا' کہتے تھے کہ اس میں بھی سامراج کی چال ہے۔ جب ہم آپس میں لڑیں مریں گے تو یہ امن قائم کرنے کے بہانے واپس آجائینگے۔ مگر برطانیہ' فرانس' کسی کا سامراج واپس نہیں آسکا' اور آج یہ سب اپنی گم گشتہ کو فراموش بھی کر چکے ہیں۔ اس پر برصغیر میں پاکستان کے نام سے مسلم سلطنت کا قیام بھی مشیت الٰہی کے تحت تھا ورنہ ہمارے سب رہنما کانگریس کے ساتھ متحدہ اور مخلوط حکومت پر رضامند ہوگئے تھے اور یہ حکومت قائم بھی ہوگئی تھی لیکن پاکستان کا قیام ایک معجزہ کی شکل میں ہوا۔ عرب ملکوں کو حقیر اور فقیر سمجھا جاتا تھا۔

مگر یہ بھی معجزہ ہے کہ وہ تیل کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔ عربوں نے تیل کی دریافت کے لئے ایک بھی کوشش نہیں کی تھی مگر خدا نے زمین پھاڑ کر دولت کے خزانے ان کے سپرد کردئے۔ اسے بھی تاریخ میں محض ارادہ الٰہی کی کارفرمائی کہا جاسکتا ہے ورنہ عربوں نے تو اس کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی اور وہ آج بھی کسی منصوبہ بندی کے اہل نہیں ہیں۔ برطانیہ کے گھریلو نوکر چاکر آج بڑے بڑے شیوخ بنے بیٹھے ہیں اور ان کا برطانوی آقا رخصت ہوگیا ہے۔ وہ نئے امریکی آقاؤں کے تحفظ میں زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں لیکن تاریخ اس مقام پر رکی نہیں ہے۔ آگے بڑھے گی اور ارادہ الٰہی پھر کچھ سے کچھ کردے گا۔

امریکہ کے لئے بڑا درد سر کمیونزم کا نیا بھوت تھا۔ اگر روس اور چین متحد رہتے تو وہ ساری دنیا فتح کرسکتے تھے لیکن یہ بھی قدرت کا کھیل تھا کہ دونوں حلیف سے حریف ہوگئے۔ روس اور چین کے اس تفرقہ نے کمیونزم کا زور توڑا۔ پھر بھی روس ایک سوپر پاور تھا جو گرم پانیوں کی جانب بڑھا چلا آرہا تھا مگر افغانستان میں وہ ذلیل و خوار ہوا اور روس کی سوپر پاور آن واحد میں زمین پر آگری۔ جنگ کے دنوں میں ہم سنتے تھے کہ ہٹلر نے دنوں اور گھنٹوں میں مشرقی یورپ کو فتح کیا لیکن اس نئے دور میں منظر دیکھنے میں آیا کہ بغیر کسی جنگ کے مشرقی جرمنی' پولینڈ' چیکوسلواکیہ' یوگوسلاویہ وغیرہ کے حکمراں ہار گئے۔ ان میں سے کئی ملکوں کا وجود ہی ختم ہوگیا اور وہ پارہ پارہ ہیں۔ یہی حال سوپر پاور روس کا ہوا جس کی حیرت انگیز ٹوٹ پھوٹ کے بطن سے وسط ایشیا کے نو آزاد ممالک نے تاریخ میں دوبارہ اپنی جھلک دکھائی۔ اس کے بعد کہا جاتا تھا کہ امریکہ واحد سوپر پاور ہوگیا ہے لیکن اب عام طور پر زوال امریکہ کی پیش گوئیاں امریکی اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہو رہی ہیں۔ تاریخ کے پروفیسر' فلاسفر' سیاست کے ماہر' معیشت کے استاد روزانہ امریکی اخبارات میں امریکہ کے پیش آمدہ زوال پر خبردار کررہے ہیں اور ایسے ہی ایک مضمون پر نیویارک ٹائمز نے سرخی لگائی ہے کہ "بدترین زمانہ آنے والا ہے" اب تو خود امریکہ کو اپنے ڈوبنے کا یقین ہو چلا ہے۔ ایک امریکی پروفیسر نے کہا ہے کہ امریکی نظام فرد اور سماج کے مفادات میں مطابقت نہیں پیدا کرسکا۔ اس نے اپنے شہریوں میں نہ کسی اعلیٰ وارفع نصب العین کی حرارت پیدا کی' نہ کوئی اخلاقی روح پھونکی۔ خود غرضی' نفسانفسی کے ماحول میں اب ہیروئن ہے' ایڈز ہے اور بے روز گاری منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ اگر امریکہ اپنے عالمی کردار کے پیچھے دوڑتا ہے تو اس کی داخلی دنیا کا انتشار اور بڑھے گا۔ اگر داخلی مسائل پر توجہ کرتا ہے تو بیرونی وقار اور مفاد کا جنازہ نکلے گا۔ امریکہ سے قطع نظر یورپ کی یہ حالت ہے کہ یورپی اتحاد' یورپی پارلیمینٹ' مشترکہ یورپی منڈی' مشترکہ یورپی کرنسی' سب کچھ سوچ کر اور منظور کرنے کے باوجود اتحاد کی بجائے خانہ جنگیاں ہیں۔ پورے یورپ میں اس کی قدیم قبائلی جنگیں واپس آتی نظر آرہی ہیں اور ہر طرف رنگ' نسل' زبان علاقہ کے تعصبات آمادہ فساد ہیں۔ بیرونی ملکوں کے کارکنوں پر حملے ہوئے ہیں کہ یہ کیوں ہمارے ملک میں روز گار کے لئے آئے جبکہ جرمنی کے چانسلر کا کہنا ہے کہ اگر بیرونی ملکوں کا سستا مزدور نہ ہو تو جرمنی کی برآمدات ٹھپ ہوجائینگی اور جرمنی اقتصادی تباہی سے دوچار ہوجائے گا۔ اس انتباہ کے باوجود جرمنی میں نازی ازم کا مردہ زندہ ہوگیا ہے اور بھوت بن کرناچ رہا ہے۔ ادھر سابقہ سوویت یونین میں ہر طرح کا فتنہ و فساد برپا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اس کے اثرات یورپ کے لئے بھی تباہ کن ہونگے اور کچھ نہیں تو پناہ گزینوں کے لشکر ابھی سے آنے شروع ہوگئے ہیں۔ ایشیا میں دیکھئے تو چین اپنا لباس نہیں اپنی روح بھی تبدیل کررہا ہے۔ مارکیٹ اکانومی کے راستے پر چلنے کے لئے بڑی بڑی تبدیلیاں کر لی گئی ہیں اور مزید کی جائینگی۔ بھارت جو سیکولرزم اور جمہوریت کی ایک مثال تھا' اس کے متعلق وائس آف جرمنی نے کہا ہے کہ بھارت میں سیکولرزم اور جمہوریت دونوں کا جنازہ نکل گیا۔ نیویارک ٹائمز نے ادارئے میں لکھا ہے کہ بھارت ہندو راشٹر بن رہا ہے اور اس کے اثرات دور دور تک ہونگے۔ مسلمان ملکوں میں سرد جنگ کے زمانے کی نصب کردہ آمریتوں کا خاتمہ ہوگیا ہے یا ہو رہا ہے اور مقابلہ پر جو دوسرا عنصر خم ٹھوک کر سامنے آرہا ہے وہ مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق بنیاد پرستوں کا ہے جس کی طاقت روز بروز بڑھتی چلی جائیگی۔ امریکہ کے ماہرین کا مشورہ ہے کہ امریکہ کو اس بنیاد پرستی سے صلح کرلینی چاہیے کیونکہ وہ اسے شکست نہیں دے سکتا۔ آمریت کے شکار ملکوں میں بنیاد پرست ہی جمہوریت' غیر منصفانہ اقتصادی نظام اور بدعنوانیوں سے پاک انتظامیہ کے لئے نگاہ امید سے دیکھے جارہے ہیں۔ خود سعودی عرب میں زبردست ہلچل برپا ہے۔ کویت میں امیر کویت کو بنیاد پرستوں کا مطالبہ مان کر الیکشن کرانے پڑے۔ مصر میں حسنی مبارک کے دن گنتی کے ہیں اور مسلمان ملکوں میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ جیسی بھی ہے سب کو حیرت انگیز چیز نظر آرہی ہے کہ جس مولوی کو سیاست سے بے دخل کردیا گیا تھا وہ نئی شان اور آن بان کے ساتھ واپس آگیا ہے۔ اسے بھی خدائی قدرت کا کھیل سمجھنا چاہیے کہ جس اسلام کے متعلق سمجھ لیا گیا تھا کہ اس کا دور گزر گیا وہ نئے دور میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اور یہ تاریخی جائزہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ جہان قدیم کے مسمار ہونے کا وقت قریب ہے' جہان نو پیدا ہوگا اور یہ نہ اشتراکیت کا ہوگا نہ سرمایہ داری کا ہوگا بلکہ اسلام کا ہوگا۔ لیکن سب کچھ خود بخود نہیں ہوجائے گا اس کے لئے ملت اسلامیہ کو خود بھی کوشش کرنی ہوگی۔ کوشش کے لئے مناسب حالات خدا پیدا کررہا ہے۔ اگر ان حالات سے فائدہ نہ اٹھایا گیا اور مسلمان اپنی پرانی دنیا میں مگن رہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں مصروف رہے تو جو جہان قدیم مسمار ہو رہا اس کے ملبہ کے نیچے موجود مسلمان ہی دفن ہونگے اور ان کا عالم اسلام دفن ہوگا اور پھر خدا اپنی یہ قدرت بھی دکھا سکتا ہے کہ ایک بالکل ہی کافر علاقہ سے کافر قوم کو مومن و مسلم بنا کر اٹھائے اور اس کے ہاتھوں اسلام کا جہاں نو تعمیر کرائے۔ یہ قوم جرمن بھی ہوسکتی ہے' جاپانی بھی ہوسکتی ہے اور کوئی اور بھی ہوسکتی ہے۔ خدا موجود مسلمانوں کا محتاج نہیں وہ اپنے دین کے لئے خود ہی انتظام کرتا ہے اور تاریخ میں اس ارادہ الٰہی کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔

انقلابی عمل میں مزاحمت اور تصادم کے مراحل

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

حق و باطل کی کشاکش کا تدریجی عمل

ڈاکٹر اسرار احمد

بعض حضرات کو نہ معلوم کیوں مزاحمت اور تصادم کے الفاظ سے چڑ اور الرجی سی ہوگئی ہے حالانکہ اگر ذرا بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ کائنات میں جہاں توحید خالق اور توحید ربوبیت کے عملی مظاہر بھی اضداد کے مابین توافق اور باہمی ہم آہنگی کی صورت میں یقیناً موجود ہیں' وہاں مزاحمت اور تصادم کا اظہار تو ہر سطح پر اور ہر چہار جانب نمایاں طور پر ہو رہا ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق!" کے مصداق دنیا کی اصل رونق اور چہل پہل تو مزاحمت اور تصادم ہی کے بل پر قائم ہے یہاں تک کہ توافق اور ہم آہنگی کے مظاہر اس کے پیچھے چھپ کر رہ جاتے ہیں۔

خالص مادی اور میکانکی سطح پر نیوٹن کے شہرہ آفاق قوانین حرکت میں سے اولین اور اہم ترین یہ ہے کہ "ہر شے حالت جمود و سکون یا ایک ہی رخ اور ایک ہی رفتار پر حرکت کی کیفیت کو برقرار رکھتی ہے الا آنکہ اس پر کوئی بیرونی قوت اثر انداز ہو" اور تیسرا اور آخری یہ ہے کہ "ہر عمل کا ایک مساوی اور مخالف رد عمل لازمی ہے! اور ان دونوں کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی حرکت یا تبدیلی نظر آتی ہے وہاں کسی عمل اور اس کے مخالف رد عمل میں تصادم بھی لازماً موجود ہوتا ہے اور وہ حرکت اور تبدیلی پیدا ہی صرف اس وقت ہوتی ہے جب اثر انداز ہونے والی بیرونی طاقت مزاحمت کرنے والی داخلی قوت سے مقدار میں بڑھ جائے۔

اسی طرح حیاتیات کی سطح پر ہر ذی حیات میں اپنی ذات اور نسل کے بقاء اور تحفظ کا جذبہ لازماً موجود ہوتا ہے جس کے لئے اسے قدرت نے دفاع اور جارحیت (آفنس اینڈ ڈیفنس) کے اعضاء و جوارح سے "مسلح" کیا ہوا ہے۔ پھر جملہ حیوانات میں جہاں کہیں گروہی سطح پر توافق و تعاون کے مظاہر بھی نظر آجاتے ہیں وہاں ہر آن اور ہر جانب نمایاں ترین معرکہ "تنازع للبقا" اور "جہاد زندگانی" ہی کا برپا نظر آتا ہے۔ (ان میں سے پہلی اصطلاح حفیظ جالندھری نے شاہنامہ میں بہت خوبصورتی سے استعمال کی ہے یعنی۔

مجھے مسجد سے کتب کی طرف تقدیر نے کھینچا
تنازع للبقا کی آہنی زنجیر نے کھینچا!

اور دوسری اصطلاح علامہ اقبال کے اس مشہور شعر میں وارد ہوئی ہے کہ۔

یقین محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

پھر اس تنازع للبقا اور جہاد زندگانی کے ضمن میں سب جانتے ہیں کہ "بقائے اصلح" (سروائیول آف دی فٹسٹ) کا قانون کارفرما ہے۔

یہ معاملہ فطری طور پر حیات انسانی کی بلند ترین سطح یعنی عمرانیات کے میدان میں سب سے زیادہ گھمبیر اور بھرپور ہو جاتا ہے' چنانچہ کسی معاشرے یا ملک میں جو بھی اعتقادی' سماجی' اقتصادی اور سیاسی نظام قائم ہوتا ہے وہ اپنی بقاء اور دوام کے معاملے میں بہت حساس اور چاق و چوبند ہوتا ہے اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کو حتیٰ الامکان در نہیں آنے دیتا بلکہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ حالات جوں کے توں برقرار رہیں یعنی "اسٹیٹس کو" قائم رہے اور جب بھی اسے کسی تبدیلی کی خواہش کا احساس یا ایسی کسی کوشش کا علم ہوتا ہے فوراً ہانک پکار شروع ہو جاتی ہے کہ۔ نظام کہنہ کے پاسبانو! یہ معرض انقلاب میں ہے!" لہٰذا اپنی ساری قوتوں کو جمع کرو اور اس تبدیلی کا راستہ روکو۔

اس کی ایک نہایت خوبصورت مثال قرآن حکیم میں سورۂ طٰہٰ کی آیات ۶۳ اور ۶۴ میں فرعون اور اس کے حواریوں کے اس قول کی صورت میں وارد ہوئی ہے جو انہوں نے جادوگروں کو حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں خم ٹھونک کر میدان میں اترنے کے ضمن میں کہے تھے یعنی "یہ موسیٰؑ اور ہارونؑ چاہتے ہیں کہ تمہارے مثالی اور اعلیٰ تمدن کا خاتمہ کردیں پس اپنی پوری صلاحیت اور مہارت کو بروئے کار لاؤ اور ان کے مقابلے میں صف آرا ہو جاؤ"۔ گویا کسی معاشرے میں پہلے سے رائج نظریاتی' اعتقادی اور سماجی تصورات' یا کسی ملک میں بالفعل قائم سیاسی اور اقتصادی نظام میں کوئی تبدیلی اس وقت تک برپا نہیں کی جاسکتی جب تک کہ تبدیلی کے خواہش مند لوگ اس معاشرے یا نظام کی داخلی مزاحمت کو نیچا نہ دکھادیں اور تصادم کے جملہ مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر کر فیصلہ کن فوقیت اور برتری حاصل نہ کرلیں۔

مزید برآں قرآن حکیم کا تو بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ عالم انسانیت میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر حق و باطل اور خیر و شر کے مابین ایک مسلسل کشاکش' آویزش اور مقابلہ و مزاحمت کا عمل جاری رہے۔ چنانچہ ایک جانب ہر انسان کے باطن میں بھی نفس امارہ اور روح ملکوتی کے مابین جنگ ہر دم جاری رہتی ہے اور دوسری جانب اجتماعی اور تمدنی سطح پر بھی "ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز۔ چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی" کا عمل مسلسل جاری ہے۔

جسٹس کیانی مرحوم کی اس مشہور پھبتی کے مصداق جو انہوں نے پاکستان کے پہلے ملک گیر مارشل لاء پر چست کی تھی یعنی "اگرچہ بدقسمتی تھا تو

کبھی بھی نہیں آتی' لیکن اس بار تو وہ بٹالینوں کی صورت میں آئی ہے" عہد حاضر میں سائنسی اور صنعتی ترقی کے باعث اس تصادم اور کشاکش نے بھی نہایت گھمبیر صورت اختیار کر لی ہے جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ۔" دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش۔ تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا" اور " اللہ کو پامڑی مومن پہ بھروسہ۔ ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا"۔

اس موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین اور حسین ترین آیت سورۂ انبیاء کی آیت ۱۸ ہے جس میں حق و باطل کے اس تصادم کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ "ہم ضرب لگاتے ہیں باطل پر حق کی' جو اس کا بھیجہ نکال دیتا ہے' تو وہ نابود ہو جاتا ہے" گویا اس معمورہ انسانی میں جو قوم یا امت یا حزب یا جماعت حق کی حمایت میں باطل کے خلاف نبرد آزما ہوتی ہے " ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ" اور "صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم!" کی مصداق کامل بن جاتی ہے (یاد آیا کہ اب سے دو سال قبل ان ہی دنوں امریکہ میں لاس اینجلز میں ٹیلی ویژن پر عراق کے صدر صدام حسین کا خلیج کی جنگ سے پہلے کا وہ انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا جو بغداد میں امریکہ کے سب سے ماہر اور شاطر سیاسی انٹرویو لینے والے شخص "ڈین راڈر" نے لیا تھا' اس وقت یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوئی تھی کہ صدام حسین کی پشت پر اسی آیت مبارکہ کا نہایت حسین طغریٰ آویزاں تھا۔ تاہم یہ صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے ورنہ راقم کو خوب معلوم ہے کہ صدام حسین خالص طحدانہ اور نسل پرستانہ نظریات کا حامل شخص ہے اور اس کے اور قرآن حکیم کے مابین سوائے عربی زبان کے اور کوئی قدر مشترک موجود نہیں ہے)۔

الغرض مزاحمت و تصادم اور کشاکش و آویزش کائنات کا وہ عمومی قانون ہے جس سے گریز اور فرار کے راستے بالعموم منافقت تک لے جاتے ہیں۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے اور اللہ سے دعا کرے کہ وہ اسے حق کی حمایت اور نصرت میں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس راہ میں تامین حیات استقامت اور بالآخر شہادت کی موت سے سرفراز کرے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنے بارے میں بھی یہ قول مبارک صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہوا ہے کہ "میری شدید خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں" (گویا آپؐ نے اللہ کی راہ میں چار بار قتل ہونے کی تمنا کا اظہار کیا) اور آپؐ نے تمام مسلمانوں کو بھی متنبہ فرمایا ہے کہ "جو مسلمان اس حال میں مرا کہ اس نے نہ کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو' نہ ہی اس کی آرزو دل میں رکھی ہو' تو اس کی موت ایک قسم کے نفاق پر ہوگی" (مسلم' ابوداؤد اور نسائی)۔

تاہم اس تصادم اور ٹکراؤ کے کچھ مراحل ہیں جن میں ایک فطری اور منطقی تدریج ہے جسے ملحوظ نہ رکھا جائے تو غایت خلوص و اخلاص کے باوجود کوششیں ناکام اور قربانیاں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی انقلابی کوشش کے لئے ان مراحل کا گہرا شعور اور ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی جانب پیش قدمی کی شرائط کا صحیح فہم لازمی ہے' بصورت دیگر دنیا میں تو ناکامی یقینی ہے ہی۔ کسی دینی تحریک کے وابستگان میں اس ناکامی کا جو رد عمل پیدا ہوتا ہے اس کی بنا پر یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ پچھلے کئے کرائے پر بھی " حبط اعمال" کا خط تنسیخ پھر جائے اور اس طرح عاقبت بھی برباد ہو جائے۔

جیسے کہ ان کالموں میں اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے' انقلابی عمل کے دوران مزاحمت اور تصادم کے جملہ مراحل کا کامل مرقع تو صرف سیرت النبیؐ میں نظر آتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف نے ان کا استنباط آنحضورؐ کی سیرت مطہرہ ہی سے کیا ہے' لیکن ہر مسلمان آپؐ کی ذات مبارک سے جس والہانہ عقیدت اور محبت کے رشتے میں بندھا ہوا ہے اس کے باعث بالعموم جب کوئی بات آپؐ کی ذات یا آپؐ کی حیات طیبہ کے واقعات کے حوالے سے بیان ہوتی ہے تو اس کے گرد عظمت اور تقدس کا اتنا روشن ہالہ بن جاتا ہے کہ نگاہیں چکا چوند ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدح و ستائش اور تعظیم و تقدیس کا جذبہ اتنی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ اتباع کا جذبہ اس کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔

بنا بریں مناسب یہ ہے کہ انقلابی عمل کے ان مراحل تصادم کو پہلے اصولی طور پر سمجھ لیا جائے اور پھر اس خاکے میں سیرت مطہرہ کا رنگ بھرا جائے۔

اس سے قبل انقلابی جدوجہد کے جن تین مراحل کا تذکرہ ہو چکا ہے ان میں بھی "تصادم" کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ مثلاً دعوت و تبلیغ کے دوران نظریات کے مابین تصادم جاری رہتا ہے' اور اس کے ضمن میں بھی بقائے نسل ہی کا قانون کار فرما ہوتا ہے یعنی اسی فکر اور نظریے کو غلبہ حاصل ہوتا ہے جو عقلی اعتبار سے نسبتاً زیادہ قابل تسلیم اور فطرت انسانی سے نسبتاً زیادہ قرب رکھنے والا ہو پھر تنظیم کے تقاضے بھی اسی صورت میں پورے کئے جاسکتے ہیں کہ جماعتی فیصلوں کے مقابلے میں اپنی ذاتی رائے کو دبایا جائے اور انانیت اور جھوٹی عزت نفس سے مقابلہ کر کے نفس کو شکست دی جائے۔ اسی طرح تربیت کا پورا عمل بھی مسلسل مجاہدہ نفس کا متقاضی ہے۔ تاہم ان جملہ مراحل کے دوران "تصادم" خفی اور غیر محسوس صورت میں ہوتا ہے۔ اس کی جلی اور محسوس صورت پہلے سے قائم نظام کے "رد عمل" کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔

اس رد عمل کی اولین صورت یہ ہوتی ہے کہ نئے فکر اور نظریے کو مذاق اور تمسخر کا موضوع بنا کر انقلابی دعوت کو گویا چٹکیوں میں اڑا دیا جائے۔ اور خاص طور پر جو شخص داعی کی حیثیت سے سامنے آیا ہو اس کی ذات کو ایک جانب طنز اور استہزاء کا ہدف بنا کر اس کی قوت ارادی کو کچل دیا جائے اور دوسری جانب اس پر الزامات عائد کر کے' بہتان لگا کر اس کی شخصیت کو "متنازعہ" بنا دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس لئے کہ اگر خود داعی ہی کی ہمت جواب دے جائے یا اس کی ذات ہی مشکوک بن جائے تو ظاہر ہے کہ انقلابی دعوت خود بخود ختم ہو جائے گی اور کسی مزید اقدام کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

لیکن اگر داعی باہمت ہو اور اس وار کو جھیل جائے تو رد عمل کا دوسرا اور شدید تر مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ ہے جسمانی تعذیب اور تشدد کا' جس کی زد میں سب سے بڑھ کر انقلابی دعوت کو قبول کرنے والوں کے دو طبقات آتے ہیں۔ یعنی ایک نوجوانوں کا طبقہ اس لئے کہ ان پر "بزرگوں" کو حقوق اور اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو معاشرے کے پست طبقات سے تعلق رکھتے ہوں اس لئے کہ وہ بے یار و مددگار ہوتے ہیں اور انہیں کوئی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ اگرچہ ہر انقلابی دعوت اپنا مخاطب اول سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات ہی کو بناتی ہے لیکن اس کی دعوت پر عملاً لبیک کہنے والے لوگوں میں ابتداء زیادہ تعداد ان ہی دو طبقات سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

یہ دونوں مرحلے، جیسے کہ عرض کیا جاچکا ہے، معاشرے کی جانب سے انقلابی دعوت کے فطری "رد عمل" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے جواب میں انقلاب کے علمبرداروں کا صبر محض یا عدم انتقام یا انفعالی مزاحمت (پیسو رزسٹنس) پر کاربند رہنا لازم ہوتا ہے تا آنکہ اتنی قوت فراہم ہوجائے کہ رائج الوقت نظام کو چیلنج کیا جاسکے اور جیسے کہ گذشتہ صحبت میں واضح کیا جاچکا ہے کہ کسی انقلابی تحریک کی کامیابی کا اصل راز اسی میں مضمر ہوتا ہے کہ اس صبر محض سے بڑھ کر چیلنج کے مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ مناسب حد تک قوت فراہم کر لینے کے بعد ہو۔ بصورت دیگر قبل از وقت اقدام یا چیلنج سے ساری کی کرائی محنت پر پانی پھر سکتا ہے۔

تیسرا مرحلہ جو اقدام، یا چیلنج (ایکٹو رزسٹنس) پر مشتمل ہوتا ہے اور انقلابی تحریک کی قیادت کے فیصلے سے شروع ہوتا ہے۔ رائج الوقت نظام کی کسی بھی دکھتی رگ کو چھیڑ کر شروع کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ ہر پولیٹیکو سوشیو اکنامک سسٹم ایک حیاتیاتی وحدت ہوتا ہے اور اس کے کسی بھی حصے کو چیلنج کرنا درحقیقت کل کو چیلنج کرنے کے مترادف ہوتا ہے (جیسے گاندھی نے جب برٹش گورنمنٹ سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا تو "نمک بناؤ تحریک" شروع کی تھی جو بظاہر بہت معمولی اور بے ضرر نظر آتی تھی لیکن اس کے معنی یہ تھے کہ برٹش انڈیا کی پوری ٹیکسیشن اتھارٹی کو چیلنج کیا جارہا ہے۔)

اس کے منطقی نتیجے میں جلد یا بدیر تصادم کا چوتھا اور آخری مرحلہ شروع ہو کر رہتا ہے یعنی رائج نظام اب انقلابی تحریک کو کچلنے کے لئے اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ اس کی ایک صورت تو مسلح تصادم کی ہے جو سیرت النبیؐ میں اندرون ملک عرب چھ سال تک غزوات کی صورت میں جاری رہا اور دوسری ممکنہ صورت وہ ہے جو حال ہی میں ایران کے انقلاب میں سامنے آئی اور جسے "یک طرفہ جنگ" قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی لوگوں نے مظاہروں کی راہ اختیار کی اور جب ان پر گولیاں برسائی گئیں تو قدم پیچھے نہیں ہٹائے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جانیں دے دیں۔ اگرچہ خود جواب میں کوئی مسلح کارروائی نہیں کی۔ اور ظاہر ہے کہ اس چوتھے مرحلے کے بعد تو "یا تخت یا تختہ" اور "یا تن رسد بجاناں، یا جاں زتن بر آید!" کے سوا کوئی تیسری صورت ممکن ہی نہیں ہوتی۔

جب سمندر میں مچھلیاں اور بلوں میں چیونٹیاں دعائے مغفرت کرتی ہیں

کراچی میں رمضان المبارک کی نسبت سے خصوصی پروگرام

۱۔ دورۂ ترجمہ قرآن

انجینئر نوید احمد صاحب، شاگرد رشید محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رمضان المبارک میں صلوٰۃ التراویح میں ہر چار رکعات سے قبل ان رکعات میں جو آیات پڑھی جائینگی، ان کا ترجمہ و مختصر تشریح بیان فرمائیں گے۔ عشاء کی جماعت ان شاء اللہ پونے نو بجے ہوا کرے گی، خواتین کے لئے رد ے کا اہتمام ہے، پتہ درج ذیل ہے۔

قرآن اکیڈمی خیابان راحت، درخشاں، فیز۔۶ کلفٹن کراچی فون ۸۵۴۰۳۶

نوٹ: عزیز آباد سے قرآن اکیڈمی تک براستہ کریم آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، ایم اے جناح روڈ، گارڈن روڈ، زیب النساء اسٹریٹ، ٹرانسپورٹ کا بندوبست ہے۔

۲۔ دورۂ ترجمہ قرآن بذریعہ ویڈیو۔

مندرجہ ذیل مقامات پر پر صلوۃ التراویح کے ساتھ ہر چار رکعات سے قبل تفہیم قرآن کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن کے ویڈیو کیسٹ دکھائے جائینگے

(۱) ۱۱۳۔ سی، دفتر تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۲ مادام اپارٹمنٹ، چھوٹا گیٹ، ائیرپورٹ، کراچی فون ۴۸۱۴۴۲

اس پروگرام کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں صلوٰۃ التراویح میں ہمارے رفیق جناب اصغر علی مجاہد صاحب کے ایک صاحبزادے قرآن پاک سنائیں گے اور دوسرے سامع ہونگے

نوٹ: یہاں ساڑھے آٹھ بجے شب پروگرام شروع ہوں گے۔

(۲) دفتر تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۱ پہلی منزل، حق اسکوائر، عقب اشفاق میموریل ہسپتال، گلشن اقبال، کراچی۔

یہاں ہمارے نوجوان رفیق حافظ الطاف صاحب تراویح میں قرآن پاک سنائیں گے

نوٹ: یہاں رات ۹ بجے پروگرام شروع ہوگا۔

ان کے علاوہ درج ذیل پتے پر قریب کی مسجد میں نماز تراویح کی ادائیگی کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن کے ویڈیو کیسٹ دکھائے جائینگے۔ برمکان عبدالعزیز بٹ صاحب

(۱) ۲۴۔ ڈی، ملیر کینٹ بازار، کراچی فون ۴۵۰۰۴۹۷

نوٹ: یہاں خواتین کے لئے پردے کا اہتمام ہوگا۔ پروگرام ساڑھے نو بجے شب شروع ہوگا۔

(۲) اسرہ ماڑی پور کے رفقاء بھی اپنے ہاں اسی طرح سے پروگرام کریں گے۔

۳۔ دورۂ ترجمہ قرآن بذریعہ ویڈیو برائے خواتین

یکم رمضان المبارک سے روزانہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ ترجمہ قرآن کے ویڈیو کیسٹ کے ذریعے خواتین کے فہم قرآن میں اضافہ کا بندوبست مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

(۱) برمکان جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان

۱۴۵۔ بی بلاک ۱۔ ڈی ۱۳۔ گلشن اقبال کراچی فون ۴۶۶۴۷۵

وقت دوپہر ساڑھے گیارہ بجے (یہ وقت خواتین کی سہولت کے پیش نظر رکھا گیا ہے)

(۲) ۷۷۔ سی کے ڈی اے اسکیم نمبر ۱ کارساز بالمقابل نیشنل اسٹیڈیم، وقت دوپہر ۱۲ بجے تا ۲ بجے دوپہر۔

۴۔ دورۂ ترجمہ قرآن بذریعہ آڈیو کیسٹ برائے خواتین۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے آڈیو کیسٹ خواتین کو سنوائے جائیں گے، برمکان جناب محمد نعیم الدین صاحب امیر تنظیم اسلامی ضلع شرقی نمبر ۱ کراچی۔

۲۔ آر عابد ٹاؤن گلشن اقبال کراچی۔ وقت دوپہر ساڑھے گیارہ بجے روزانہ۔

۵۔ منتخب نصاب کے ویڈیو کیسٹس کی نشرات بذریعہ ویڈیو کیبل نیٹ ورک۔

کراچی کے کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں بہت سے گھر ایک وی سی آر سے لیڈز کے ذریعے جڑے ہوئے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

علماء کا دردِ ملی اور مسلم لیگ کی "سحر انگیزیاں"

پاکستان کا مطلب کیا!-چند غیر سنجیدہ چھوکروں کا نعرہ تھا؟؟

تقسیم میں بددیانتی کا مقصد دونوں اقوام کو باہم متحارب رکھنا تھا تاکہ "سونے کی چڑیا" کبھی دعویٰ ہمسری نہ کرے

مرزا ایوب بیگ' امیر تنظیم اسلامی لاہور شہر' کی بے لاگ تاریخ نگاری

جیسا کہ پہلی قسط میں عرض کیا جاچکا ہے کہ ہندوستان کے انگریز حاکم یہ بھانپ چکے تھے کہ آزادی اور جمہوریت کی جو لہر ساری دنیا میں اٹھی ہے ہندوستان بھی نہ صرف اس سے متاثر ہے بلکہ جوش و جذبہ اور آزادی کی خاطر مالی و جانی قربانی میں بھی افریقہ و ایشیا اور دنیا کے دوسرے خطوں کی نسبت کہیں آگے ہے۔ ہند کی تاریخ کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک عام قاری بھی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے خاتمہ پر انگریز اگرچہ تمام ہندوستان پر بلا شرکت غیرے قابض ہوچکا تھا لیکن اپنے نوے سالہ عہد میں یعنی 1947ء میں ہند کو خیرباد کہنے تک ہندوستان کی مذہب و نسل سے تعلق رکھنے والی مختلف قوتیں کسی نہ کسی انداز میں اس کے خلاف سپر انداز رہیں' کبھی حربی اور زیر زمین سرگرمیوں کے رنگ میں اور کبھی سیاسی اور جمہوری پیش قدمی کے انداز میں۔ بہرحال ایک طرف ہند کی اقوام کی اس مسلسل جدوجہد کے ردعمل میں اور دوسری طرف جنگ عظیم II میں گراں قیمت فتح حاصل کرنے کے بعد برطانیہ معاشی اور سماجی سطح پر نڈھال ہوگیا تھا لہٰذا وہ ہند سے نکلنے کا فیصلہ تو کرہی چکا تھا لیکن اسے ایک متضاد صورت حال کا سامنا تھا۔ نہ تو وہ ہندوستان کو اس طرح چھوڑنا چاہتا تھا کہ اقوام ہند بالخصوص ہندو اور مسلم ایسے باہمی انتشار اور خون ریزی پر اتر آئیں اور ہند کی بغل میں روس (جہاں 1917ء کے بالشویک انقلاب کے نتیجے میں کمیونزم اپنے جوبن پر تھا اور اپنے نظریہ کو برآمد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوا رہا تھا اور مغربی جمہوریت کیلئے خطرہ بنتا جارہا تھا اور جس کے ایجنٹ یہاں پہلے ہی کچھ نہ کچھ قدم جماچکے تھے) ہڑتالوں اور تالہ بندیوں کے ذریعے علاقے کو اور معاشی بدحالی اور مہنگائی' جو جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہوچکی تھی' کو ایکسپلائٹ کرے اور یوں آزاد ہندوستان کا جھکاؤ کمیونسٹ بلاک کی طرف ہوجائے یا کم از کم روسی اثر و رسوخ کا ہند میں نفوذ ہی ہوجائے۔ دوسری طرف وہ اپنا اخراج اتنا smooth بھی نہیں چاہتا تھا کہ متعدد پہلوؤں مثلاً جغرافیائی حدود' مالی' بالخصوص زمینی وسائل (یاد رہے انگریز کے ورود Entrance تک ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا) اور تاریخی پس منظر وغیرہ' کے حوالے سے ماضی کی یہ عظیم مملکت یعنی ہندوستان کل کلاں ایک سپر طاقت کی حیثیت سے بھی ابھر نہ سکے اور یورپی مفادات پر بھی اثر انداز نہ ہوسکے' بالخصوص خلیج کے علاقہ پر جہاں تیل سیال سونے کی حیثیت اختیار کررہا تھا اور جہاں یورپ اور امریکہ اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرچکے تھے۔ اندریں صورت طاقتور متحدہ ہندستان یعنی شیروشکر پاک بھارت بھی اسے کسی طرح منظور نہ تھے لہٰذا انگریز کے خروج ہند کے انداز کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایسا طرز عمل اختیار کیا کہ اقوام ہند خصوصاً ہندو مسلم بری طرح اور اپنی پوری قوت سے' اس طرح نہ ٹکراسکیں کہ ایک کا وجود کا ختم ہوجائے بلکہ ایسی حکمت عملی اپنائی جائے کہ ہندوستان اگر متحدہ رہے تو دونوں اقوام آپس میں الجھی رہیں اور اگر تقسیم ہوکر دو ملک بن جائیں تو دریائی پانی اور کشمیر وغیرہ تنازعات کو جنم دینے والی تقسیم ہی ان کے مابین مستقل آویزش کا سبب بنی رہے۔ قصہ کوتاہ' وائسرائے ہند کے انتخابات کے بارے میں 19 دسمبر 65ء کے اعلان نے ہندوستان کو سیاسی بخار کی لپیٹ میں لے لیا اس لئے کہ یہ محض انتخابات کا اعلان نہیں تھا وائسرائے نے واضح کردیا تھا کہ انتخابات کے نتیجہ میں ایک مجلس دستور ساز وجود میں آئے گی اور پھر بڑی جماعتوں کے اشتراک و تعاون سے نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے گی اور اس کونسل کا بنیادی مقصد ہند میں حکومت خوداختیاری کا قیام ہوگا۔ مسلم لیگ جو 37ء کے انتخابات میں بری طرح پٹ چکی تھی آٹھ نو سال میں عوامی جماعت کی نہ سہی' عوامی تحریک کی صورت یقیناً اختیار کرچکی تھی۔ یہ انتخابات اس کیلئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکے تھے۔ ایک طرف کانگرسی لیڈروں کی ریشہ دوانیاں تھیں اور ان کا باربار کا یہ دعویٰ طعن کی صورت اختیار کرچکا تھا کہ مسلم لیگ مسلمان عوام کی نہیں' صرف مسلمان امراء کی ترجمان ہے۔ پھر یہ کہ نیشنلسٹ مسلمان اس کیلئے بڑی دشواریاں پیدا کررہے تھے۔ کانگرس نے روایتی عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیشنلسٹ مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا صدر بنالیا تھا۔ گو ان کی حیثیت بقول قائداعظم "شوبوائے" کی تھی لیکن اصل مقصود مسلم لیگ کے اس دعویٰ کی تردید تھی کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس وقت وہ بے روح مگر مسحور کن نعرہ لگا "پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ" جس نے دشمنان مسلم لیگ کی صفیں تلپٹ کردیں اور "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا نعرہ حقیقی صورت اختیار کرتا نظر آنے لگا۔ اگرچہ بعدازاں' بلکہ آج سے صرف چند سال قبل'

شوکت حیات اور دولتانہ جیسے مسلم لیگی' جنہوں نے بہ نفس نفیس تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا اور آج بھی بفضل تعالیٰ حیات ہیں' یہ کہہ کر اس نعرہ سے اعلان برآت کر چکے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ کا نعرہ کسی "سنجیدہ" مسلم لیگی نے نہیں بلکہ ایسے چند ایسے "چھوکروں" نے لگایا تھا جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ راقم اس نکتہ پر انہی صفحات میں بعد ازاں بحث کرے گا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ جوں جوں انتخابی مہم آگے بڑھی' یہ محسوس ہونا شروع ہو گیا کہ مسلم لیگ اگر کھمبے کے ساتھ بھی ٹکٹ باندھ دے گی تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔ کانگریس نے وحدت ہند کی بنیاد پر انتخابی مہم چلائی اور اس کیلئے اس نکتہ کو ایکسپلائٹ کیا کہ مسلم لیگ تو مسلمان کے سوا کسی کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتی جبکہ کانگریس ہندوستان کی ہر قوم کے ہر فرد کے مفادات کی محافظ ہے لہٰذا ہندوستان کے وسیع تر مفاد میں کانگریس کو ووٹ دیا جائے۔ ظاہرا کتنی منطقی اور سمجھ میں آنے والی بات لگتی ہے لیکن کانگریس کی دور رخی کا اندازہ کریں کہ بہت سی مسلمان نشستوں پر مسلم لیگ کے خلاف احراریوں' خاکساروں اور مسلم مجلس کے امیدواروں کو support کیا۔ دوسری طرف قائداعظم نے ہندوستان کے مسلم علاقوں کے تفصیلی دورے کئے اور مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ پاکستان کے قیام میں ہی ان کے مسائل کا حل مضمر ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت حاصل نہ ہو جائے۔ بہرحال 20 دسمبر 1945ء کا سورج اس نوید کے ساتھ طلوع ہوا کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کا مقدر اور تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی 30 میں سے 30 نشستیں یعنی سو فیصد کامیابی حاصل کی آٹھ نشستوں پر تو مسلم لیگ کے مسلمان مخالف ضمیر کی لعن طعن سے مجبور ہو کر الیکشن سے پہلے ہی دستبردار ہو گئے اور مسلم لیگی بلامقابلہ منتخب ہو گئے باقی 22 میں سے 19 نشستوں پر مخالفین کی ضمانتیں ہی ضبط ہو گئیں۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کے 88.80 فیصد ووٹ ملے۔ نہرو نے ایک بیان میں اپنی اس شکست کو تسلیم کیا اور مسلم لیگ سے سوال کیا کہ وہ بتائے کہ وہ پاکستان میں کن کن علاقوں کو شامل کرنا چاہتی ہے۔ قائداعظم نے اس موقعہ پر واضح کر دیا کہ مسلم لیگ ہر اس تجویز کا خیر مقدم کرے گی اور اس پر مذاکرات کیلئے اس کے دروازے کھلے ہیں بشرطیکہ پاکستان کا قیام اس تجویز کی روح ہو۔ یہاں آگے بڑھنے سے پہلے "پاکستان کا مطلب کیا' لاالہ الااللہ" کے نعرے کا اصل پس منظر اور شوکت حیات کے اس قول "یہ نعرہ محض چند چھوکروں نے لگایا تھا اور سنجیدہ مسلم لیگی قیادت نے عوام کو یہ نعرہ قطعاً نہیں دیا تھا" کا تجزیہ لازم ہے۔ پھر اسی حوالہ سے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ مسلمانان ہند کا اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنا درحقیقت کس محرک کا شاخسانہ تھا۔ کیا ایک چھوٹی قوم کا بڑی قوم کے ہاتھوں معاشی سیاسی اور سماجی سطح پر زک اٹھائے جانے یا نگل لئے جانے کے خوف سے تھا یا فکر اقبال کے مطابق اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا بقول قائداسلام کے پیغام اخوت و مساوات و حریت کا عملی نمونہ پیش کرنا مقصود تھا۔؟ جہاں تک محترم اور بزرگ مسلم لیگی لیڈر شوکت حیات کے اس قول کا تعلق ہے کہ یہ نعرہ محض چند چھوکروں نے لگایا تھا اور مسلم لیگی قیادت اس سے لاتعلق تھی' ان کا یہ قول کسی طرح بھی قابل فہم نہیں' اس لئے کہ جس طرح اس نعرہ کی ہندوستان کے طول و عرض میں گونج سنوائی گئی وہ محض چند "چھوکروں" کے بس کی بات نہیں تھی البتہ محترم شوکت حیات صاحب اس نعرہ کو چند چھوکروں کا نعرہ قرار دیکر اصلاً جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل محرک "مذہبی یا دینی" نہیں تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ایک طویل عرصہ سے وقتاً فوقتاً زیر بحث رہا ہے۔ راقم کی رائے میں بھی "پاکستان کا مطلب کیا۔۔۔" محض ایک انتخابی نعرہ تھا جو "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا تسلسل یا اسے ہی آگے بڑھائے جانے کا عمل تھا۔ مجوزہ پاکستان میں اسلام کا بحیثیت نظام نافذ ہونا' کم از کم اس وقت تو ایک طے شدہ اور شک و شبہ سے بالاتر معاملہ تھا لیکن یہ کہنا کہ تحریک پاکستان کا اصل محرک صرف مذہب ہی تھا محض ایک جذباتی بات ہے اور تاریخی حقائق سے لگا نہیں رکھتی۔ دوسرے الفاظ میں مسلم لیگ کی یہ سوچ تو ہو سکتی ہے کہ جب ملک ہی مسلمانوں کا ہو گا تو نظام یہاں اسلام کے سوا بھلا اور کون سا نافذ ہو سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تحریک احیاء اسلام کی تحریک کسی طرح بھی نہیں تھی۔ علماء دین اور زعماء مسلم لیگ کے درمیان یہی نکتہ اختلاف تھا۔ علماء اور نیشنلسٹ مسلمان قیام پاکستان کو مسلمانوں کی طاقت تقسیم کرنا گردانتے تھے اور بڑے خلوص سے ایسا سمجھتے تھے۔ یہاں ضمناً یہ بات عرض کرنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ جو لوگ مسلم لیگ یا قیام پاکستان کی مخالفت کی بناء پر علماء کرام پر رکیک حملے اس وقت کرتے تھے یا اب کرتے ہیں ان کے بارے میں کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی کم سمجھی اور نادانی کا مظاہرہ کرتے ہیں' بلکہ صحیح تر الفاظ میں' بہتان تراشی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس طرح کہ بعض عاقبت نااندیش لوگوں نے انہیں ٹکاؤ مال اور کانگریس کے زر خرید تک کہہ ڈالا۔ حالانکہ یہ مسلمانان ہند کی بہتری کے معاملے میں محض نکتہ نظر کا فرق تھا۔ قیام پاکستان کے مخالف علماء یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح مسلمانوں کی طاقت تقسیم ہو جائے گی۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمان نہ صرف متحد اور یک جان ہو کر ہندو کا مقابلہ کریں گے بلکہ ہندوؤں کی مخالفت اور دشمنی انہیں متحد بھی رکھے گی۔ لہٰذا یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ علماء بہرحال عوامی اور دنیوی معاملات میں زیادہ الجھے ہوئے نہیں تھے اور روزمرہ کی زندگی میں انہیں ہندو بنئے اور اس کے متعصب رویئے سے پالا نہیں پڑتا تھا۔ تجارتی معاملات ہوں یا سرکاری نوکری کے بکھیڑے' ہندو جس طرح مسلمان کو کارنر کرتا جا رہا تھا اور اس کے معاشی استحصال کا کوئی موقع نہیں گنواتا تھا' ان تمام زیادتیوں سے رجال دین یا تو کلیتاً بے خبر تھے یا چونکہ کم از کم براہ راست متاثر نہیں ہو رہے تھے لہٰذا ان کا موقف اسی پس منظر کی بنیاد پر تھا' کسی لالچ کی بنیاد پر نہیں تھا جبکہ دوسری طرف مسلم لیگ اب ایک جماعت تھی' عوامی مسائل براہ راست اس کی نگاہ میں تھے لہٰذا اس کا یہ نکتہ نظر بننا کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے تسلط سے مکمل طور پر آزاد اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں' بالکل فطری تھا۔ ہم یہ فیصلہ تو صادر کر سکتے ہیں کہ مسلم لیگ کا موقف بالکل درست تھا۔ ہندو متحدہ ہند میں مسلمان کو ہر لحاظ سے تباہ کر دیتا اور آج پاکستان میں مسلمانوں کی معاشی حالت جس سطح پر ہے' متحدہ ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس تمام تر بحث سے یہ فیصلہ کرنا بھی کسی قدر آسان ہو گیا ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل محرک مذہبی یا دینی بنیادوں پر استوار قرار دینا محض جذباتیت یا انتہائی کم تر سطح پر ہی اثبات کا پرتو رکھتی ہے اور پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ محض "شوگر کوٹ" کئے ہوئے انتخابی نعرے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جبکہ تحریک پاکستان کا اصل اور قوی تر محرک ایک بڑی قوم کے ہاتھوں "سیاسی" اور بالخصوص "معاشی" استحصال سے نجات تھا جس میں

احیائے دین کا دور دور تک شائبہ بھی نہیں تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جب میدان صرف مسلمانوں کیلئے خالی ہوگیا تو قوم کا ہر فرد الاماشاء اللہ حصول زر کی دوڑ میں سبقت لے جانے کیلئے یوں سرپٹ دوڑا کہ نہ صرف حلال و حرام کی قیود کو پامال کرتا گیا بلکہ اس کی زر کی اندھی ہوس نے قومی اور ملی مفادات کو روندنے سے بھی گریز نہ کیا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ ضرورت پڑنے پر ملکی اور قومی عزت و وقار کی بولی بھی لگادی۔ بہرحال اس موضوع پر اصل بحث اس وقت ہوگی جب انشاء اللہ قیام پاکستان کے بعد یعنی 1947ء کے بعد کے واقعات بیان ہوں گے یہ سرسری ذکر تو تحریک پاکستان کے محرک کے حوالے سے ہونا چاہئے تھا لہٰذا واضح کیا گیا۔

دسمبر 45ء کے انتخابات کے بعد اور تقسیم ہند سے قبل کیبنٹ مشن اور مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن اہم ترین موضوعات ہیں جن پر انشاء اللہ اگلی قسط میں مفصل گفتگو ہوگی لیکن مرکزی مجلس دستور ساز کے انتخابات اور کیبنٹ مشن کے وفد کے ہندوستان پہنچنے سے پہلے ایک واقعہ اور ایسا ہوا جس نے انگریز حاکموں کی پریشانیوں میں فیصلہ کن اضافہ کردیا۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

آزاد ہند فوج کے جن افسروں کے خلاف مقدمے چل رہے تھے' برطانوی کمانڈر انچیف نے رائے عامہ کے تیور اور ہندوستانیوں کی اپنے خلاف نفرت کو بھانپتے ہوئے انہیں رہا کیا تو ہندوستان میں مقیم برطانوی فوجی افسروں نے بہت ذلت محسوس کی ویسے بھی وہ جنگ کے دوران طویل عرصے تک اپنے گھروں سے دور رہنے کی وجہ سے تھکاوٹ اور بیزاری کے شکار تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو یہ تحریک شروع کی کہ انہیں فوج سے فارغ کرکے گھر بھیجا جائے پھر انہوں نے ہندوستانی افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ توہین آمیز رویہ اختیار کرنا شروع کردیا۔ اس پر فوری ردعمل بحریہ کے ہندوستانی عملہ پر ہوا اور سب سے پہلے بمبئی کی بندرگاہ میں لنگرانداز ایک جنگی جہاز "تلوار" کے ہندوستانی عملہ نے بغاوت کردی۔ جب برطانوی افسروں نے اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے انضباطی کارروائی کی تو بغاوت بندرگاہ میں لنگرانداز چوبیس جنگی جہازوں میں پھیل گئی۔ سپاہی جہازوں سے فرار ہوکر بمبئی شہر میں پھیل گئے اور شہر کے یورپی رہائشی علاقوں پر دھاوا بول دیا۔ جہازوں پر کانگریسی اور مسلم لیگی جھنڈے لہرادیئے گئے۔ شہر میں بری فوج اور باغی سپاہیوں میں لڑائی ہوئی۔ بہت سے افراد بھی مارے گئے اور جانی نقصان بھی وسیع پیمانے پر ہوا۔ گو صرف چار دن میں ہی بغاوت پر قابو پالیا گیا لیکن انگریز پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ہندوستان میں امن و امان کے سلسلے میں اور برطانوی شہریوں کی حفاظت کے معاملے میں اب وہ ہندوستانی افواج پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ یہاں یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ بمبئی کی کمیونسٹ پارٹی نے باغیوں کی کھلم کھلا حمایت کی تھی۔ (جاری ہے)

اس ہفتے کا نامہ خوں فشاں

نیو ورلڈ آرڈر مسلمان علماء اور دانشوروں کیلئے بڑا چیلنج ہے

دین کی طرف یہودی سازشوں کا ابتدائے سفر

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نیو ورلڈ آرڈر کو جیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ روزانہ اخبار کے علاوہ دو تین ماہوار رسالے بھی آتے ہیں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر میں اپنے کس پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ اس ماہ رسالہ ماہ نامہ محقق کے ذریعہ اس کی کچھ باتیں معلوم ہوئیں۔ یوں تو نیو ورلڈ آرڈر کی ہر شق فرعونانہ تکبر سے بھرپور ہونے کے علاوہ یہودیت کی مکاری سے بھی پر ہے۔ ایسے بھی تاثر ملتا کہ نیو ورلڈ آرڈر اپنے ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں اب نہ تو جان باقی ہے' نہ عقل اور نہ غیرت۔ بہتر ہو تاکہ میثاق میں شائع کردیا جاتا تاکہ پڑھے لکھے اسلام کے شیدائی تو دشمن کے عزائم سے آگاہ ہوسکتے۔ پچھلے دنوں عرب ممالک بالخصوص عرب امارات سے پاکستانیوں کو نکالا گیا۔ ہم حیران تھے کہ یہ بیٹھے بٹھائے شیوخ امارات کے ہاتھوں سے باز کیوں اڑ گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ ان تابع مہمل شیوخ نے امریکی ہدایات کے تحت کیا ہے کیونکہ نیو ورلڈ آرڈر کی ایک شق یہ بھی ہے کہ عرب امارات سے پاکستانیوں اور دیگر مسلم ممالک کے باشندوں کو نکال دیا جائے اور ان کی جگہ سری لنکا' فلپائن وغیرہ ممالک سے مزدور اور کارکن بلائے جائیں تاکہ وہ لوگ آکر مقامی آبادی میں خلاف اسلام باتیں پھیلا کر ساحلی عربوں کو اسلام سے بیگانہ کریں۔ نیو ورلڈ آرڈر کی ایک شق یہ بھی ہے کہ خلیجی ریاستوں کی دولت کو امریکہ' برطانیہ اور فرانس کے زیر انتظام چلنے والے بنک کے ذریعہ کنٹرول کیا جائے۔ خیر یہ تو عربوں کا معاملہ ہے' ہمارا معاملہ یہ ہے کہ پاکستان اور سوڈان جیسے بنیاد پرست ممالک کو مشکلات میں پھنسے رہنے دینا چاہئے اور یہاں ان علماء کی سرپرستی کی جائے جو افتراق و انتشار پھیلائیں۔ ایسے دانشوروں کو امداد دی جائے جو جدیدیت کے نام پر اسلام پر حملے کریں۔ اس پروگرام میں امریکہ' برطانیہ اور فرانس برابر کے شریک ہیں۔ اس بنک گراؤنڈ کے ساتھ ایک طرف جناب ساجد نقوی کا یہ بیان پڑھئے کہ اب عالم اسلام کے فیصلے تہران میں ہوا کریں گے۔ دوسری طرف سپاہ صحابہ کے ایک لیڈر کا یہ بیان پڑھئے کہ ایران حضرت عمرؓ کے عہد میں فتح ہوا' اس لئے ایران حضرت عمرؓ کے ارادتمندوں کے سپرد کیا جائے۔ بظاہر جناب ساجد نقوی اور جناب اعظم طارق کے بیان جذباتی طور پر بے ضرر بلکہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کی تہہ میں جو زہر بھرا ہوا ہے وہ وہی ہے جس نے بغداد کو خاک و خون میں ملا دیا تھا۔ کیا مسلمان علماء کو اب اکٹھے ہوکر سوچ کر نیو ورلڈ آرڈر کو ناکام بنانے کیلئے افتراق' فرقہ پرستی کی جگہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد اور ایثار کا درس نہیں دینا چاہئے۔ پچھلے تیرہ سو سال میں اس فرقہ پرستی کے نام پر لاکھوں خون بہاکر بھی تاریخ نہیں بدلی جاسکی نہ بدلی جاسکے گی۔ کیا اب بھی لوگوں کو یہ سمجھ نہیں آنی چاہئے کہ ہماری بقا ہمارے اتحاد میں ہے۔ بے شمار فرقے بن بن کر مٹ گئے لیکن شیعہ و سنی دونوں فرقے قائم رہیں گے اور یہ بات جو حضرت عثمان غنیؓ نے کہی تھی کہ مسلمانو! خلیفہ کے قتل کے بعد تم قیامت تک متحد نہ ہوسکو گے۔ اس لئے یہ انتہائی اقدام نہ کرو لیکن بدبختوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو دشمنان اسلام چاہتے تھے۔

نیو ورلڈ آرڈر مسلمان علماء کیلئے' مسلمان

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

ہندو ذہنیت تاریخ کے آئینے میں

بدھ مت کی ابتداء سے سانحہ بابری مسجد تک

جب تک باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی ہندو رعایا کو سکون و انصاف کی زندگی میسر رہی

صادق علی عباسی ــ رفیق تنظیم اسلامی، کراچی

ہفت روزہ ندائے خلافت بتاریخ ۲۸ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا "ایک بین الاقوامی جریدے میں بھارتی کالم نگار جناب پران گپت کا اظہار ندامت"۔ اس مضمون کو جناب سردار اعوان نے اخذ و ترجمہ کیا۔ اس مضمون میں پران گپت نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمالی بھارت میں ایودھیا کے مقام پر سولہویں صدی میں تعمیر شدہ بابری مسجد کو مسمار کرنا ہندو مذہب کی روایات کے خلاف ہی نہیں بلکہ اس کے مفادات کے لئے بھی ضرر رساں ہے۔ اس سلسلے میں پران گپت کا اظہار ندامت بحیثیت انسان قابل ستائش اور قابل قدر ضرور ہے لیکن اگر تاریخ ہند کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب بھی ہندو قوم کو خودمختاری اور عروج میسر ہوا اس نے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ وہ ظلم، سفاکی اور جارحیت کا مظاہرہ کیا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کی اولین مثال دور قدیم میں مہاتما گوتم بدھ کے ماننے والوں کے ساتھ سلوک میں ملتی ہے۔ ہندو راجاؤں نے اپنے ادوار حکومت میں ظلم کئے، زیادتی اور لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا کہ ان کو اپنی سلامتی اور عافیت چین، جاپان، کوریا، ملائشیاء، انڈونیشیاء اور ہند چینی کے علاقوں میں بسنے میں ہی نظر آئی۔ جبکہ مہاتما گوتم بدھ ہندوستان کے رہنے والے تھے ان کی تعلیم کا مرکز بھی ہندوستان ہی رہا تھا اور ان کے اولین پیروکار بھی ہندوستان کے ہی رہنے والے تھے۔ بلکہ کچھ عرصہ بدھوں کی بھارت میں حکومت بھی رہی۔

دوسری اور جدید مثال تقسیم ہند کے موقع پر سامنے آئی جب ہندوؤں کو خود مختاری میسر آئی۔ انہوں نے سکھوں کو آلہ کار بنا کر مشرقی پنجاب، یوپی، بہار اور بھارت کے دیگر علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم، زیادتی، لوٹ مار اور قتل عام کا مظاہرہ کیا جبکہ سندھ پنجاب سرحد اور بلوچستان کے مسلمانوں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے علاقوں کے ہندوؤں کو باعزت طور پر ریلوے اسٹیشنوں پر الوداع کہا تھا اور انسانیت کی تاریخ رقم کی تھی۔ اور تاریخ ہند گواہ ہے جب حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی ان ادوار میں ہندو رعایا کو نہایت سکون اور انصاف کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملا جس کی مثال کے طور پر محمد بن قاسم اور شہنشاہ اکبر اور دیگر بادشاہوں کے ادوار قابل ذکر ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں تو ہندوؤں کو بے حد مراعات حاصل تھیں۔ ان کو دربار میں پوری رسائی تھی، ہندو بیگمات کا دربار میں حد سے زیادہ اثر و رسوخ تھا، خود اکبر کی ملکہ ہندو تھی۔

تیسری مثال آج کی بھارتی حکومت کی ہے جو تاریخ ہند کی سب سے مضبوط اور طاقت ور حکومت ہے۔ اگر موازنہ کیا جائے تو اشوک (ASHOIC THE GREAT) کی حکومت بھی اس قدر طاقتور نہ تھی جیسی آج بھارتی حکومت ہے، جس کا شمار دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں میں ہوتا ہے۔ اس نے پہلے دس سال میں کشمیر، حیدر آباد دکن، جوناگڑھ اور دیگر ہندوستانی ریاستوں کو ہڑپ کیا جس سے اس کی سیکولرازم کی قلعی کھل جاتی ہے۔

کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ۴۵ سالوں سے ہو رہا ہے، اقوام متحدہ (U.N.O.) کی قراردادوں کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں، یہ عالمی اقوام کے لئے شرم کی بات ہے۔ دوسرے دس سالوں میں بھارت نے اپنی توسیع پسندی کا ایک بار پھر مظاہرہ کرتے ہوئے براہ راست پاکستان پر ۱۹۶۵ء میں حملہ کر دیا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے منہ کی کھائی۔ مگر چالاکی اور مکاری کی یہ بات بھی غور و فکر کی طالب ہے کہ اس نے مشرقی پاکستان کے علاقوں پر فوج کشی نہیں کہ ورنہ بنگالی مسلمان بھارتی حکومت کے اس جارحانہ اقدام سے نفرت کرنے لگتے۔ تیسرے دس سالوں میں بھارتی ہندو ایجنٹوں نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر قیام بنگلہ دیش میں اپنا ناپاک کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو ایک اور چرکہ لگایا۔ مکتی باہنی میں نصف سے زائد بھارتی ہندو ایجنٹ تھے جو مشرقی پاکستان کے معاشرے میں ۲۵ سالوں میں سمو دیئے گئے تھے اور سقوط ڈھاکہ کے وقت بھارتی فوج کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ چوتھے اور پانچویں دس سالوں میں بھارتی ہندو حکومت اپنے اندرونی خلفشار میں مبتلا ہے۔ مگر بنیادی طور پر اپنے ناپاک مہا بھارت کے نصب العین سے غافل نظر نہیں آتی بلکہ ان کا یہ عزم روز بروز مزید پختہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو پاکستان کے لئے نہ صرف خطرہ عظیم ہے بلکہ مسلمانان پاکستان کے لئے موت کا پروانہ ہے۔

تحقیق اور تاریخی جائزے کے حوالے سے درحقیقت ہندو قوم اپنی ذات سے بے حد عیار مکار اور بزدل نظر آتی ہے۔ اسی ناطے اس قوم میں ظلم، سفاکی اور جارحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ بزدل قوموں میں فراخ دلی کا عنصر سرے سے

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی کشمکش

معرکہ فرعون وکلیم ۔۔۔ ایک داستان انقلاب!

پانچ ہزار سال پہلے کے حکومتی مزاج اور آج کے رد عمل میں فرق بہت کم ہے۔

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

خطہ ایشیا کا ہو یا یورپ کا' قوم متمدن ہو یا صحرائی و کوہستانی' قصہ ماضی کا ہو یا حال کا' یا پھر مستقبل کا تجزیہ' ان سب میں ایک طرح کا واقعاتی اشتراک اور نفسیاتی تسلسل ہوتا ہے جو نام اور مقام کے ذرا سے فرق کے ساتھ اپنی جوہری وحدت کے اعتبار سے ایک سا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اسی موضوع کو ہم لیتے ہیں کہ کہیں انقلابی تحریک اٹھے تو عمائدین و امراء اور ارکان و اعیان حکومت کا رد عمل کیا ہوتا ہے؟ ہمیں آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے حکومتی مزاج اور آج کے رد عمل میں بہت کم اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن حکیم میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان کشمکش بڑی تفصیل کے ساتھ ملتی ہے اور غالباً وہ تمام مراحل جو آج بھی کسی انقلابی تحریک کو درپیش ہوسکتے ہیں ذرا کم یا بیش داستان کلیم و فرعون میں بیان کردئے گئے ہیں' اور انقلاب کا ایک پورا دستور العمل اپنے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ اس واقعہ میں موجود ہے۔ اس جہد انقلاب کے اہم ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اتنی تفصیل کے ساتھ اور متعدد مقامات پر صرف یہی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ' الاعراف' الشعراء' القصص' طٰہٰ' الرحمان اور المومن میں ان سارے مرحلوں کی تفصیل ملتی ہے اور کلام الٰہی نے پوری شان اعجاز کے ساتھ حکمران طبقے کی خوفزدگی' استبداد' سازش' حواس باختگی' بزدلی اور وہم پرستی کی نفسیات کو خوب خوب واضح کردیا ہے۔

فرعون نے اپنا اقتدار تین بنیادوں پر مستحکم کر رکھا تھا اس ضمن میں بعض صراحتیں اور بعض اشارے قرآن مجید میں ملتے ہیں۔

۱۔ جبرو استبداد (فرعون نے زمین میں سرکشی کا رویہ اختیار کر رکھا تھا): (القصص: ۴)

۲۔ "لڑاؤ اور حکومت کرو کا اصول" (اپنی قوم کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا): (القصص: ۴)

۳۔ قومی و نسلی امتیاز (قبطی النسل بمقابلہ بنی اسرائیل)

فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں اور جوانوں کے قتل اور عورتوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا ہوا تھا (البقرہ: ۴۹) اس حکم میں اس کے اقتدار کی بقاء کے تینوں تقاضے پورے ہورہے تھے۔ ایک جبرو استبداد کہ ہر خورد و جوان کو تہ تیغ کرکے اپنی دھاک بٹھانا مقصود تھی اور ظاہر ہے لوگوں پر خوف طاری ہوتا ہوگا۔ دوسرے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کہ بنی اسرائیل اور قبطیوں کے درمیان اس بنیاد پر نسلی فسادات ہوتے ہوں گے اور تقسیم اور منافرت کی جڑیں گہری ہوتی ہوں گی۔ تیسرے قومی و نسلی امتیاز کہ کہیں بنی اسرائیل کی شرح پیدائش قبطیوں سے بڑھ نہ جائے اور وہ اس طرح غالب نہ آجائیں۔ بنی اسرائیل کے بچوں اور جوانوں کے قتل عام کے پس منظر میں بعض روایات کے مطابق فرعون کو ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ دربار کے نجومیوں نے یہ خبر دے رکھی تھی کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بچہ بڑا ہو کر اس کے اقتدار کو چیلنج کرے گا تو اس وسوسے کی بناء پر اس نے "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری" کے عین مطابق جوانوں اور بچوں کو ذبح کردینے کا حکم دیا ہوا تھا کہ اگر وہ "موہومہ بچہ" جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا ہے تو اس کا صفایا کردیا جائے یا ابھی دنیا میں سانس لینے کے قابل ہوا ہے تو اس کا بھی قصہ تمام کردیا جائے۔ اس کی شیطانی حکمت عملی کے علاوہ اس کے اقتدار کی دو اور بھی معاون قوتیں تھیں جس سے اس کا پنجہ استبداد مزید سنگین اور خونیں ہوگیا تھا۔ ان میں سے ایک قوت قارون کی تھی اور دوسری ہامان کی' اور اس طرح قبطی اقتدار کے اقالیم ثلاثہ (Trinity) فرعون' قارون اور ہامان تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تینوں محض نام نہ رہے بلکہ علامت بن گئے اقتدار دولت اور افسر شاہی کی۔ اس مکروہ تکون میں فرعونیت اقتدار کی قارونیت دولت کی اور ہامانیت افسر شاہی کی علامت ٹھہری اور یہ سہ جہتی اتحاد اور خبیث گٹھ جوڑ آج بھی سکہ رائج الوقت کی طرح اقتدار کی مضبوطی کی شاہ کلید تصور ہوتی ہے۔ اگرچہ زمانے کے پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بلکہ کتنے دریا بہہ گئے' انسانی حقوق کے چارٹر مرتب ہوگئے' مجلس اقوام بن گئی' غلامی قانوناً ممنوع قرار پائی' دو عظیم جنگوں نے نسلوں کی نسلیں بدل ڈالیں' ایٹمی ہتھیاروں نے قوموں کے مزاج پلٹ ڈالے' صلح و جنگ کے نئے معاہدے ہوگئے حکومتوں کے بننے اور بگڑنے کے ضابطے تبدیل ہوگئے' انسان پگڈنڈیوں سے چل کر مریخ تک پہنچ گئے' اور بادشاہتیں نام کو رہ گئیں لیکن کسی بھی حاکم کی نفسیات دیکھ لیں فرعونیت' قارونیت اور ہامانیت کے جراثیم پل کر پہلے سے زیادہ موٹے تازے ہوگئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے ہے کہ اگر اقالیم ثلاثہ نے اپنا مزاج نہیں بدلا تو موسیٰ بن عمران کی معنوی اولاد آج بھی اپنے ڈھب پر قائم ہے۔

ع وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں

بدلیں۔

شرار بو لہبی اگر نہیں بجھی تو چراغ مصطفوی بھی نہیں بجھایا۔ اگر تیراندازی کی مشق جاری ہے تو جگر آزمانے کا سلسلہ بھی روز اول کی طرح باقی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نام بدل گئے' مقام بدل گئے اور اہتمام بدل گئے۔ فرعون اور افسر شاہی کے جملہ پیشگی اقدامات اور حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ "بچہ" بالآخر جنم پا ہی لیتا ہے جس کے ہاتھوں قارون اپنے خزانے سمیت زمین میں دھنسنے والا اور فرعون اپنی ہامانی ذریت کے ساتھ غرقاب ہونے والا تھا ع تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ کے مصداق فرعون ایک "بچے" کے ڈر سے پوری بنی اسرائیل کی ماؤں کی گود اجاڑنے پر تلا ہوا تھا مگر اس بچے کی پرورش کا اہتمام قدرت نے خود فرعون کے محل میں کردیا اور اس میں حکمت یہ نظر آتی ہے کہ وہ "بچہ" شاہی ماحول کا قریب سے کھلی آنکھوں کے ساتھ مطالعہ اور اس نظام کے کمزور حصوں کا براہ راست مشاہدہ کر کے اس سٹیبلشمنٹ پر کاری ضرب لگا سکے جس نے ایک قوم کو ننگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔

قدرت کا قانون' فطرت کا قاعدہ' زمانے کا تجربہ' قوموں کا تجربہ اور تاریخ کا فیصلہ یہ بتاتا ہے کہ جب ارباب اقتدار کی سرکشی اور رعایا کی بے بسی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پردۂ غیب سے کچھ نہ کچھ ظہور پذیر ہو کر رہتا ہے اور وہ لمحہ پھیل کر انقلاب بن جاتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

"ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کمزوروں پر احسان کر کے انہیں زمین کا وارث بنادیں" (القصص:۵)۔

بالآخر وہ وقت آن پہنچا جس وقت سے بچنے کے لئے فرعون نے نجانے کتنے ابن الوقت اپنے اردگرد جمع کر لئے تھے۔ ایک دن فرعون کے دربار میں کلیم اللہ کی آواز گونجی اور فرعون اور فرعونی ذریت پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنے انتظامات اور اقتدار کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے باوجود کوئی ان کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر سکتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے ہمراہ دربار فرعون میں پہنچے اور فرمایا۔

"ہم رب کے فرستادہ ہیں اور بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ (آزادانہ) جانے دو" (الشعراء ۱۶۔۱۷)

فرعون نے شاہانہ بدمستی میں "رب اعلیٰ" کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ آپ نے اس کے اس دعوے کو جھٹلایا' فرعون نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا تھا آپ نے اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ دونوں باتیں فرعون اور آل فرعون کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتریں اور ان کا دماغ بجنے لگا' بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ بجلی کے کوندنے کی طرح لپکا اور فرعون کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے تو چندھیا کر رہ گئیں۔

فرعون نے اس موقع پر اپنی چرب زبانی' ابلیسی طرز کلام اور پندار اقتدار سے کام لیتے ہوئے کہا'

"کیا تو بچہ نہیں تھا جب ہم نے تجھے پالا' تو نے عمر کے کئی سال ہمارے پاس گزارے' بعد ازاں تو وہ کر گیا جو کچھ کر کر گیا تو بڑا احسان فراموش ہے" (الشعراء ۱۸۔۱۹)

آپ نے فوراً جواب دیا'

"رہا تیرا احسان' واقعہ یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (الشعراء ۲۲) یعنی اس میں احسان والی کیا بات ہے یہ تو قدرت کا انتظام تھا کہ مجھے پیدا ہوتے ہی دریا برد کردیا گیا اور میرا صندوق کسی طریقے سے تمہارے محل تک پہنچا اور تم نے میری پرورش محض اس لئے کی کہ میں تمہاری نگاہوں میں رہ کر تمہارا ہی بن جاؤں اور دوسرے یہ کہ مجھ پر احسان کا مطلب یہ کہاں سے نکل آیا کہ میری پوری قوم کو غلام بنا دیا جائے۔ فرعون نے اب اپنا لہجہ بدلا اور روایتی دھمکیوں پر اتر آیا۔

"اگر میرے علاوہ کسی خدا کی بات کی تو تمہیں قید و بند کی سزا بھگتنا پڑے گی (الشعراء ۲۹)۔ دھمکیوں کا اثر ظاہر ہوتا نظر نہ آیا تو ایک شاعر کا روپ دھار لیا اور اپنے کاسہ لیسوں سے مخاطب ہوا۔

"یہ صاحب جو فرستادہ رب بن کر آئے ہیں بڑے پاگل ہی لگتے ہیں (الشعراء ۲۷)۔ ظاہر ہے فرعون' ہامان' قارون' فوج' سپاہ' قانون' وسائل' برادری اختیارات اور اقتدار کو ایک بے نوا اور عمران کا بیٹا یکایک چیلنج کرنے لگے ان کی نظر میں پاگل پن ہی تو تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ کے فیصلے ہمیشہ "فرزانوں" کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ "دیوانوں" کی خواہش کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔ البتہ تاریخ فرعون ایسے مسخروں کو کچھ وقت تک ڈھیل دیتی اور ان کی سزا کو سنگین اور انجام کو عبرتناک بننے کا موقع فراہم کردیتی ہے۔

آل فرعون نے جب یہ محسوس کیا کہ آل عمران کا مطالبہ خلاؤں میں نہیں ان کے ایوانوں میں گونجا ہے' خواب کا غماز نہیں حقیقت کا ترجمان ہے' تو فرعون اور اس کے کارندوں' افسروں' مصاحبوں' درباریوں' وڈیروں' منصبداروں' افسروں' مفاد پرستوں اور وفاداروں کو انجانے خدشوں نے گھیر لیا۔ اس مطالبے کے کیا مضمرات ہوسکتے ہیں؟ نتیجہ کیا نکلے گا؟ سدباب کیسے کیا جائے گا؟۔

"قوم کے سرپنچ بولے یہ چالاک جادوگر معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے یہ ہمیں حکومت بدر کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے" (الشعرا: ۱۸۔۱۹)۔ فرعون نے اپنا اقتدار جن حیلوں سے مضبوط بنا رکھا تھا اس نے سوچا موسیٰ کو بھی کچھ حوالے مل گئے ہیں اس لئے ان کا توڑ ہونا چاہیے۔ فرعون نے عوام کو باور کرا رکھا تھا کہ میرا اقتدار فقط فوج و سپاہ کے بل بوتے پر قائم نہیں بلکہ ستاروں کی گردش' جادو کے عمل اور غیب کی تائید سے میرا سکہ چلتا ہے اور میرے اس "نیٹ ورک" کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ فرعون نے فوراً ملک بھر کے جادوگروں کو مقابلہ کرنے کے لئے طلب کیا اور حضرت موسیٰؑ کو مقابلے کی دعوت دے ڈالی۔ جناب موسیٰؑ ایک بار دل میں ہنسے تو ضرور ہوں گے کہ میں بندگی رب' آزادی' حریت' مساوات' حرمت انسانی اور انصاف کی بات کرتا ہوں اور یہ احمق جادو' ٹونے' منتر اور ستاروں کی ہانکتا ہے۔

آخرالامر بساط بچھی' خوش فہمیاں حقائق کے مقابلے میں دم توڑ گئیں' اور مقابلے پر آنے والے جادوگر جناب موسیٰؑ کے الٰہی اور انقلابی پیغام کے قائل ہوگئے۔

ان جستہ جستہ واقعات سے ملوکانہ اور آمرانہ ذہنیت' اسکی منصوبہ طرازی' حکمت عملی' طریق کار' حربوں' ہتھکنڈوں' عیاریوں اور چالاکیوں کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس طرح حکمران طبقہ رنگ بدلتا' کینچلی اتارتا' ڈنگ مارتا' آگے بڑھتا' پیچھے ہٹتا' ہیر پھیر کرتا' حیلے تراشتا اور کیسے کیسے جال بچھاتا ہے

جادوگروں کا یوں حضرت کلیم اللہؑ کا ہمنوا بننا فرعون کے خلاف عامی رد عمل پیدا کر سکتا تھا کیوں کہ عوام اب تک اپنی سادہ لوحی کے باعث فرعون کی طفل تسلیوں اور "غیبی اعانتوں" کا قائل چلا آرہا تھا۔ اب اس غیبی اعانت اور ساحرانہ قوت کا پول کھل چکا تھا چنانچہ فرعون اپنے خلاف رد عمل کی ممکنہ عوامی لہر کو قابو میں رکھنے کے لئے سیدھے سبھاؤ اپنے جاہ و جلال اور لشکر و سپاہ کا مظاہرہ کرتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے'

"میں تمہارے (جادوگروں کے) ہاتھ اور پاؤں الٹی طرف سے کٹواؤں گا اور تمہیں کھجوروں کے تنوں میں سولی چڑھاؤں گا (طٰہٰ: ۷۱)۔ اسے اب بھی

یہ ہوش نہیں آیا تھا کہ کب اور کس دور میں انقلاب دھمکیوں، گھرکیوں، بڑھکوں اور جھڑکیوں سے رکا ہے؟ یا انقلابیوں کا نشہ اترا ہے؟۔ فرعون اور اس کے حواریوں کا درد سر بڑھتا جارہا تھا، ان کے اعصاب سکڑتے جارہے تھے، ان کے کان خطرے کی گھنٹیاں بلکہ گھنٹے بجتے ہوئے سن رہے تھے، ان کا دماغ وسوسوں اور اندیشوں میں گھرتا جارہا تھا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے، پہروں سوچتے رہے اور آخر کار ایک زبردست انتقامی مہم کا فیصلہ کر کے اٹھے۔ ایک بار انقلاب پھر انہی مراحل سے گزر رہا تھا جن کا تعین تاریخ نے عرصے سے کر رکھا ہے یعنی جفاکیش اور وفا کیش ایک بار پھر آمنے سامنے آگئے، جگر اور خنجر مقابل ہوگئے اور طاقت اور عزیمت کا ٹکراؤ ہوگیا۔

قوم کے نمبردار بولے۔

"کیا آپ (فرعون) موسیٰ" اور اس کے گروہ کو کھلا چھوڑ دیں گے کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں، آپ اپنے خداؤں کو تنہا چھوڑ دیں گے؟ (القرآن)

ظاہر ہے ایسے "نمبرداروں" کی نظر میں جناب موسیٰ کا انقلاب "فساد ہی" تھا کہ بنی اسرائیل اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، زمینوں اور جاگیروں میں برابر کا حق مانگا جارہا تھا، عزت نفس کا مطالبہ ہورہا تھا جھوٹی خدائی کا طلسم اترنے والا تھا، آقائی و غلامی کا ضابطہ چیلنج ہورہا تھا، فرعونیت، قارونیت اور ہامانیت کی ملی بھگت کا پردہ چاک ہورہا تھا۔ فرعون اپنے اصلاح کاروں کی اس حمایت پر خوش ہوا اور ایک بار پھر اپنی طاقت مجتمع کر کے چنگھاڑا ہرگز نہیں ہم انہیں فساد پھیلانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم اتنے کمزور نہیں کہ ان "کمزوروں" کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ فرعون بولا "ہم ان کے جوانوں کو (بیدردی سے) ذبح کردیں گے، ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے، ہم ان پر پوری طرح حاوی اور قادر ہیں") (الاعراف: ۱۲۷)

انتقامی مہم زوروں پر آگئی۔ ظاہر ہے ایسے میں سولیاں گڑی ہوں گی، ٹکٹکیاں بندھی ہوں گی، بیچاروں کے چیتھڑے اڑے ہوں گے کہ عہد جبر کا یہی پرانا دستور ہے، فرعون ہڑبڑا اٹھا۔

"مجھے کچھ نہ کہو میں موسیٰ کو قتل کرتا ہوں وہ اپنے رب کو پکار کر دیکھے۔ مجھے ڈر ہے یہ میری قوم کا دین نہ بدل ڈالے اور معاشرے میں بے چینی نہ پیدا کردے" (المومن: ۲۶)۔

فرعون نے اپنی پوری حاکمانہ ہیبت اور شاہانہ ہیبت کو بروئے کار لاکر جملہ سرکاری مشینری کو حرکت میں لانے کا فیصلہ کیا۔ اسی اثنا میں رب العزت کی طرف سے حضرت موسیٰ کو اپنی جماعت سمیت ہجرت کا حکم ملا۔

انقلاب جوئے رواں کی طرح آگے بڑھتا ہے جو پہاڑوں سے سر ٹکرانے کی بجائے اپنا راستہ نکالتی ہے جبکہ آمریت یا دوسرے کا سر پھاڑنا جانتی ہے یا اپنا سر پھوڑنا، اس کے پاس حکمت نام کی کوئی تیسری "آپشن" نہیں ہوتی!

"تم راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑو اگرچہ تم لوگوں کا تعاقب کیا جائیگا" (الدخان: ۲۳)۔

جب فرعون کو اس بات کا علم ہوا تو اس کا پندار اقتدار کا آئینہ چھناکے سے ٹوٹ گیا کہ ان میں یہ جرأت کیسے پیدا ہوئی کہ میری حدود مملکت سے نکلنے کی کوشش کریں۔ فرعون تلملا اٹھا اور حکم دیا کہ فوج اکٹھی کر کے موسیٰ کا تعاقب کیا جائے۔ یہ گروہ قلیل ہمارے اقتدار کو چیلنج بھی کرے اور بچ کر نکل بھی جائے، یہ نہیں ہوسکتا، یہ وقت حضرت موسیٰ علیہ اسلام اور ان کے رفقاء کے لئے بڑا کٹھن، حوصلہ شکن، صبر آزما اور سخت تھا۔ جب فرعون کا لشکر ان کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا، سب بول اٹھے "(اے موسیٰ) تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب بھی دکھوں میں مبتلا ہیں (الاعراف: ۱۲۹)۔ یہ اظہار کرب عین انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ کوئی جتنا بڑا انقلابی ہو وہ پہلے بہرحال انسان ہوتا ہے جو اپنے اندر دکھ درد کی ٹیس پوری شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن ایک عام انسان اور انقلابی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ عام آدمی ایسے موقع پر حوصلہ چھوڑتا ہے اور انقلابی مصائب کا رخ موڑتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس مرحلے میں کمال یقین کے ساتھ وہ بات کہی جو پیغمبر کے شایان شان ہے فرمایا۔

"میرا رب میرے ساتھ ہے وہ عنقریب راستہ نکال دے گا" (القرآن)

جناب موسیٰ" اور ان کے ہمراہیوں نے جب یہ منظر دیکھا کہ پیچھے دشمن کی فوجیں اور آگے سمندر کی موجیں ہیں تو لمحہ بھر میں فیصلہ کیا اور سمندر میں اتر گئے۔ فرعون نے بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت تعاقب کیا اور پھر "آل فرعون تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کردی گئی" (البقرہ: ۵۰)۔

پانی نے ایک گروہ کو راستہ دے دیا اور دوسرے گروہ کے لئے ایک اجتماعی قبر کا گڑھا بن گیا جس نے سب کو نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیت اور شاندار محل تھے جنہیں وہ (بصد حسرت و یاس) چھوڑ گئے۔ کتنے ہی سامان عیش و طرب جن میں وہ شاداں و فرحاں تھے ان کے پیچھے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ یہ رہا ان کا انجام (بد) اور ہم نے دوسروں کو اس کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین اور انہیں ذرا بھی مہلت نہ ملی۔ اس طرح بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب سے نجات دی (الدخان: ۲۵-۳۱)

داستان فرعون و کلیم دراصل مسلح ملوکیت اور نہتی رعیت کی جنگ کی داستان ہے۔

معرکہ فرعون و کلیم تاریخی طور پر غلامی اور آزادی کی کشمکش ہے۔

اس میں انقلاب کے چیدہ چیدہ تمام مراحل آگئے ہیں، ملوکیت کا کردار، افسر شاہی کا طرز عمل کاسہ لیسوں کا انداز کار، امراء کی کارستانیاں اور مراعات یافتہ طبقے کا مزاج سبھی واضح ہوجاتا ہے۔ نہ ملوکیت آسانی سے راستہ دیتی ہے نہ افسر شاہی درخواستوں پر کان دھرتی ہے نہ قارونی جماعت سیدھے طریقے سے مناتی ہے اور نہ یہ تکون انصاف کا عمل کرتی ہے۔ یہ صرف کشمکش میں ہار مانتی ہے۔ تاریخ کا یہ تجربہ بار بار دہرایا جاتا رہے گا۔ یعنی کلیم و فرعون کی ٹکر، ابراہیم" و نمرود کا معرکہ اور چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی کشمکش، یہی انقلاب کا عنوان بھی ہے اور حاصل بھی!

بقیہ: نقار خانہ

محترمہ ہمارے ہاں کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ وہ ایسا مشورہ ہرگز نہ دیتیں۔

آخر میں ایک مزے کی بات، ہیومن رائٹس سوسائٹی پاکستان کے چیئرمین جو کسی زمانے میں وفاقی وزیر قانون بھی رہ چکے ہیں نے کہا ہے کہ سوسائٹی امریکی نمائندگان کی جانب سے جنیوا میں انسانی حقوق کے کمیشن کے روبرو اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ آبروریزی کو جنگی جرم قرار دیا جائے اور اس جرم میں ملوث افراد کے خلاف جنگی مجرموں کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک بین الاقوامی قانون وضع کیا جائے۔ کاش کہ ایس ایم ظفر صاحب ایسی کوئی تحریک اپنے ملک میں چلاسکتے، کیونکہ اپنے گھر والوں کا حق پڑوسی کے حق پر فائق ہوتا ہے۔ گھر میں آگ لگی ہو تو پڑوس والوں کو مشورہ نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے گھر میں لگی آگ کو بجھائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اپنا گھر خاکم بدہن خاکستر ہوجائے۔

آٹھویں ترمیم!۔۔۔مقاصد و محرکات

بشریہ روزنامہ جنگ

آٹھویں ترمیم کے واضح سیاسی مقاصد تھے' جن میں سرفہرست مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔۔ ملکی صدر کو حکومت کے تمام تعیناتی عہدوں کے اختیار دئے جائیں' جیسا کہ آرٹیکل ۲۱۳ میں چیف الیکشن کمشنر اور آرٹیکل ۲۴۳ میں چیف آف آرمی سٹاف اور مسلح افواج کے دیگر سربراہوں کی تقرری کے اختیارات دئے گئے ہیں۔ گورنر و اٹارنی جنرل اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کے اختیارات بھی صدر کو دئے گئے ہیں۔

۲۔۔ پارلیمانی نظام کے ڈھونگ کو برقرار رکھتے ہوئے ملکی صدر کو دو مختلف قسم کے اختیارات دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا' ایک طرف تو قومی اسمبلی اور وزیراعظم کو برخاست کرنے کی طاقت اور دوسری طرف آرٹیکل ۴۸ میں ترمیم کے ذریعے صدر کو مختلف اقسام کے صوابدیدی اختیارات دینا شامل تھا۔ آرٹیکل ۱۱۲ کے تحت گورنر کو براہ راست یہ حق دینا کہ وہ بھی صدر کی طرح صوبائی اسمبلی کو برخاست کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے صدر سے پیشگی اجازت حاصل کرلی جائے۔

آٹھویں ترمیم کا مسودہ ابتدائی طور پر پی او آرڈر نمبر ۱۴ آف ۱۹۸۵ء میں درج ہے۔ راقم الحروف کو اس وقت جنرل ضیاء الحق نے مشورہ کے لئے امریکہ سے اسلام آباد بلایا تھا' انہوں نے مجھے تحریر شدہ مارشل لاء کا ضابطہ دکھایا۔ میرے استفسار پر کہ مذکورہ تحریر تو در حقیقت نظام کی تبدیلی کے مترادف ہے۔ مرحوم ضیاء نے فرمایا کہ میرا خیال یہی تھا' مرحوم ضیاء الحق نے کہا کہ میں نے بڑی مشکل سے اپنے سینے پر پارلیمانی طرز حکومت کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ لوگ اس کے نام پر جاتے ہیں میں بھی انہیں یہ نام دے دوں گا۔ انہوں (ضیاء الحق) نے کہا میں ایسا وزیراعظم چاہتا ہوں جو میری ایک چھڑی ہلانے سے لائن حاضر ہوجائے۔

میں نے اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے کہا کہ آپ نے سسٹم بدل دیا ہے جس پر صدر نے کہا کہ مجھے شریف الدین پیرزادہ نے مشورہ دیا کہ آپ پڑھے لکھے افراد سے مشورہ نہ کیا کریں

مزید اطلاعاً ارشاد ہے کہ جناب بھٹو کے دور میں بھی آئین میں ترامیم کی گئی تھیں۔ یہ ترامیم اس بنیادی آئینی ڈھانچے سے انحراف کے مترادف تھیں 'جن پر ۷۳ء کا آئین بنایا گیا تھا' ماسوائے ایک ترمیم کے جس کا تعلق غیر مسلموں سے تھا۔ باقی تمام ترامیم کی زد میں عدالتیں اور اس کے اختیارات آئے تھے۔ موجودہ حکومت کی ۱۲ویں ترمیم کی زد بھی عدالتی نظام پر ہی پڑتی ہے لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ پاکستان میں جب بھی حکومت نے اپنے کنٹرولڈ ایوان سے ترمیم منظور کروائی اس کا مقصد اپنی وقتی دشواریوں پر قابو پانا تھا۔ لہٰذا ہماری ترامیم سے آئینی تقدس پامال ہوا۔ اس کے برعکس ۱۹۴۹ء کا بھارتی آئین اب بھی نافذ ہے۔ امریکہ کی طرح ۲۶ ترامیم کے باوجود بھی بھارتی آئین کا بنیادی ڈھانچہ اب بھی برقرار ہے۔ ترامیم کے ذریعے عدالتوں اور پارلیمانی نظام کو مزید تقویت دی گئی ہے۔

۸ ویں ترمیم کے نفاذ بنیادی طور پر قانونی اور فلسفیانہ کنفیوژن کا شکار تھے۔ صدر اور وزیراعظم کے مابین اختیارات میں توازن کی بات کرنے والے در حقیقت پارلیمانی نظام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت ملک میں آئینی اور قانونی طور پر پارلیمانی نظام موجود ہی نہیں۔ اس مرحلے پر یقیناً یہ لوگ کہیں گے کہ یہاں پر اسمبلی بھی موجود ہے اور وزیراعظم بھی کام کررہا ہے جو پارلیمانی نظام میں ہوتا ہے لیکن ایسے ممالک کی مثال موجود ہے جہاں اسمبلی بھی کام کررہی ہے اور وزیراعظم بھی 'مگر وہاں کا نظام حکومت پارلیمانی نہیں ہے جیسا کہ الجزائر یا مصر میں ہے۔ یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنرل ضیاء نے مجھے بتایا تھا کہ آٹھویں ترمیم کا مشورہ انہیں سری لنکا کے صدر جے وردھنے نے دیا تھا کہ ایسی قانونی کارروائی کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس طرز پر سوچنے کا ابتدائی مشورہ انہوں نے دیا تھا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں جو تبدیلیاں بھٹو مرحوم نے کی تھیں' ان میں صدر کو وزیراعظم کے مشورے کا پابند کردیا گیا تھا۔ پارلیمانی روایات میں یہ بات واضح رہتی ہے کہ صدر وزیراعظم کے مشورے کا پابند ہوتا ہے لیکن غلام محمد کے دور میں یہ بات محسوس کی گئی کہ اسے آئین میں بھی تحریر کردیا جائے۔ لہٰذا ۷۳ء کا آئین فلسفہ قانون کے مطابق برطانیہ' کینیڈا اور آسٹریلیا کے دساتیر سے مماثلت رکھتا تھا جہاں سربراہ مملکت کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ برطانیہ میں بھی وزیراعظم کی آمریت قائم ہے' وہاں کا وزیراعظم قانوناً اور حقیقی معنوں میں چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے اس لئے اسے قائد ایوان کہتے ہیں۔ اگر کسی بھی مسئلے پر وہاں حکومت یا وزیراعظم اسمبلی سے اپنی بات نہ منواسکے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں بھی حقیقی پارلیمانی نظام ہوتا تو گزشتہ دنوں کی شکست کے بعد سرحد حکومت کو بھی مستعفی ہوجانا چاہیے تھا۔ اس قسم کے جتنے بھی واقعات ہوتے ہیں پارلیمانی طرز حکومت کے آئینی تقاضوں کے مطابق حکومت کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ محکمے کے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کی غلطی پر وزیر کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ حال ہی میں ایک جہاز کے حادثے کے بعد بھارتی وزیر مواصلات مستعفی ہوئے۔ بھارتی وزیراعظم وی پی سنگھ بھی مستعفی ہوگئے تھے۔

پاکستان میں عجیب و غریب طرز کا پارلیمانی نظام چل رہا ہے۔ یہاں وفاقی وزیر دفاع میر ہزار خان بجارانی نے پی ڈی اے کے ساتھ واک آوٹ کیا۔ کچھ عرصہ قبل بلوچستان حکومت کے تمام وزراء اپوزیشن کے ساتھ واک آؤٹ کر گئے۔ یہ سب ناگفتہ روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہم پارلیمانی نظام کی حقیقت سے واقف نہیں۔

سر ونسٹن چرچل نے ہیرالڈ لاسکی کا یہ قول بارہا دہرایا تھا کہ وہ وزیراعظم جسے ایوان میں اکثریت حاصل ہو' کسی آمر سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس مخمصے کو چھوڑ کر مسئلے کی طرف آئیں کہ "ہم پارلیمانی طرز حکومت چاہتے ہیں یا صدارتی"...! اگر ہم پارلیمانی طرز حکومت چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ۱۹۷۳ء یا ۱۹۵۶ء کے آئین کو من و عن بحال کرنا ہوگا۔ جب پارلیمانی طرز حکومت کا فیصلہ کرلیا جائے تو پھر صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کی بحث فضول ہے۔

آٹھویں ترمیم!۔۔۔مقاصد و محرکات

بشریہ روزنامہ جنگ

آٹھویں ترمیم کے واضح سیاسی مقاصد تھے، جن میں سرفہرست مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔۔ ملکی صدر کو حکومت کے تمام تعیناتی عہدوں کے اختیار دئے جائیں، جیسا کہ آرٹیکل ۲۱۳ میں چیف الیکشن کمشنر اور آرٹیکل ۲۴۳ میں چیف آف آرمی سٹاف اور مسلح افواج کے دیگر سربراہوں کی تقرری کے اختیارات دئے گئے ہیں۔ گورنر و اٹارنی جنرل اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی تقرری کے اختیارات بھی صدر کو دئے گئے ہیں۔

۲۔۔ پارلیمانی نظام کے ڈھونگ کو برقرار رکھتے ہوئے ملکی صدر کو دو مختلف قسم کے اختیارات دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، ایک طرف تو قومی اسمبلی اور وزیراعظم کو برخاست کرنے کی طاقت اور دوسری طرف آرٹیکل ۴۸ میں ترمیم کے ذریعے صدر کو مختلف اقسام کے صوابدیدی اختیارات دینا شامل تھا۔ آرٹیکل ۱۱۲ کے تحت گورنر کو براہ راست یہ حق دینا کہ وہ بھی صدر کی طرح صوبائی اسمبلی کو برخاست کرسکتا ہے بشرطیکہ اس کے لئے صدر سے پیشگی اجازت حاصل کرلی جائے۔

آٹھویں ترمیم کا مسودہ ابتدائی طور پر پی او آرڈر نمبر ۱۴ آف ۱۹۸۵ء میں درج ہے۔ راقم الحروف کو اس وقت جنرل ضیاء الحق نے مشورہ کے لئے امریکہ سے اسلام آباد بلایا تھا، انہوں نے مجھے تحریر شدہ مارشل لاء کا ضابطہ دکھایا۔ میرے استفسار پر کہ مذکورہ تحریر تو در حقیقت نظام کی تبدیلی کے مترادف ہے۔ مرحوم ضیاء نے فرمایا کہ میرا خیال یہی تھا، مرحوم ضیاء الحق نے کہا کہ میں نے بڑی مشکل سے اپنے سینے پر پارلیمانی طرز حکومت کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ لوگ اس کے نام پر جاتے ہیں میں بھی انہیں یہ نام دے دوں گا۔ انہوں (ضیاء الحق) نے کہا میں ایسا وزیراعظم چاہتا ہوں جو میری ایک چھڑی ہلانے سے لائن حاضر ہوجائے۔

میں نے اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے کہا کہ آپ نے سسٹم بدل دیا ہے جس پر صدر نے کہا کہ مجھے شریف الدین پیرزادہ نے مشورہ دیا کہ آپ پڑھے لکھے افراد سے مشورہ نہ کیا کریں

مزید اطلاعاً ارشاد ہے کہ جناب بھٹو کے دور میں بھی آئین میں ترامیم کی گئی تھیں۔ یہ ترامیم اس بنیادی آئینی ڈھانچے سے انحراف کے مترادف تھیں، جن پر ۷۳ء کا آئین بنایا گیا تھا، ماسوائے ایک ترمیم کے جس کا تعلق غیر مسلموں سے تھا۔ باقی تمام ترامیم کی زد میں عدالتیں اور اس کے اختیارات آئے تھے۔ موجودہ حکومت کی ۱۲ویں ترمیم کی زد بھی عدالتی نظام پر ہی پڑتی ہے لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ پاکستان میں جب بھی حکومت نے اپنے کنٹرولڈ ایوان سے ترمیم منظور کروائی اس کا مقصد اپنی وقتی دشواریوں پر قابو پانا تھا۔ لہٰذا ہماری ترامیم سے آئینی تقدس پامال ہوا۔ اس کے برعکس ۱۹۴۹ء کا بھارتی آئین اب بھی نافذ ہے۔ امریکہ کی طرح ۲۶ ترامیم کے باوجود بھی بھارتی آئین کا بنیادی ڈھانچہ اب بھی برقرار ہے۔ ترامیم کے ذریعے عدالتوں اور پارلیمانی نظام کو مزید تقویت دی گئی ہے۔

۸ ویں ترمیم کے نفاذ بنیادی طور پر قانونی اور فلسفیانہ کنفیوژن کا شکار تھے۔ صدر اور وزیراعظم کے مابین اختیارات میں توازن کی بات کرنے والے در حقیقت پارلیمانی نظام کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس وقت ملک میں آئینی اور قانونی طور پر پارلیمانی نظام موجود ہی نہیں۔ اس مرحلے پر یقیناً یہ لوگ کہیں گے کہ یہاں پر اسمبلی بھی موجود ہے اور وزیراعظم بھی کام کررہا ہے جو پارلیمانی نظام میں ہوتا ہے لیکن ایسے ممالک کی مثال موجود ہے جہاں اسمبلی بھی کام کررہی ہے اور وزیراعظم بھی، مگر وہاں کا نظام حکومت پارلیمانی نہیں ہے جیسا کہ الجزائر یا مصر میں ہے۔ یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنرل ضیاء نے مجھے بتایا تھا کہ آٹھویں ترمیم کا مشورہ انہیں سری لنکا کے صدر جے وردھنے نے دیا تھا کہ ایسی قانونی کارروائی کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس طرز پر سوچنے کا ابتدائی مشورہ انہوں نے دیا تھا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں جو تبدیلیاں بھٹو مرحوم نے کی تھیں، ان میں صدر کو وزیراعظم کے مشورے کا پابند کردیا گیا تھا۔ پارلیمانی روایات میں یہ بات واضح رہتی ہے کہ صدر وزیراعظم کے مشورے کا پابند ہوتا ہے لیکن غلام محمد کے دور میں یہ بات محسوس کی گئی کہ اسے آئین میں بھی تحریر کردیا جائے۔ لہٰذا ۷۳ء کا آئین فلسفہ قانون کے مطابق برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے دساتیر سے مماثلت رکھتا تھا جہاں سربراہ مملکت کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ برطانیہ میں بھی وزیراعظم کی آمریت قائم ہے، وہاں کا وزیراعظم قانوناً اور حقیقی معنوں میں چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے اس لئے اسے قائد ایوان کہتے ہیں۔ اگر کسی بھی مسئلے پر وہاں حکومت یا وزیراعظم اسمبلی سے اپنی بات نہ منواسکے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں بھی حقیقی پارلیمانی نظام ہوتا تو گزشتہ دنوں کی شکست کے بعد سرحد حکومت کو بھی مستعفی ہوجانا چاہیے تھا۔ اس قسم کے جتنے بھی واقعات ہوتے ہیں پارلیمانی طرز حکومت کے آئینی تقاضوں کے مطابق حکومت کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ محکمے کے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازم کی غلطی پر وزیر کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ حال ہی میں ایک جہاز کے حادثے کے بعد بھارتی وزیر مواصلات مستعفی ہوئے۔ بھارتی وزیراعظم وی پی سنگھ بھی مستعفی ہوگئے تھے۔

پاکستان میں عجیب و غریب طرز کا پارلیمانی نظام چل رہا ہے۔ یہاں وفاقی وزیر دفاع میر ہزار خان بجارانی نے پی ڈی اے کے ساتھ واک آوٹ کیا۔ کچھ عرصہ قبل بلوچستان حکومت کے تمام وزراء اپوزیشن کے ساتھ واک آؤٹ کر گئے۔ یہ سب ناگفتہ روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہم پارلیمانی نظام کی حقیقت سے واقف نہیں۔

سر ونسٹن چرچل نے ہیرالڈ لاسکی کا یہ قول بارہا دہرایا تھا کہ وہ وزیراعظم جسے ایوان میں اکثریت حاصل ہو، کسی آمر سے کم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس مخمصے کو چھوڑ کر مسئلے کی طرف آئیں کہ "ہم پارلیمانی طرز حکومت چاہتے ہیں یا صدارتی"...! اگر ہم پارلیمانی طرز حکومت چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ۱۹۷۳ء یا ۱۹۵۶ء کے آئین کو من و عن بحال کرنا ہوگا۔ جب پارلیمانی طرز حکومت کا فیصلہ کرلیا جائے تو پھر صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن کی بحث فضول ہے۔

بقیہ: دورہ کشمیر

ریاست شاہین صاحب

۷۔ مولاچھ' خان افسر' راجہ یاسین خان صاحب۔

تنظیم اسلامی و تحریک خلافت کا کام آگے بڑھانے کے سلسلے میں بھی باہم مشورہ کیا گیا۔ دفتر تنظیم اسلامی رنگہ میں لٹریچر کی کمی دور کرنے اور کیسٹس Cassettes بھی فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور معاونین کی تربیت کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ شام ۵ بجے جب یہ کارروائی اختتام پذیر ہوئی تو مغربی افق پر شفق نمایاں تھا جس پر اہل بصیرت کے لئے یہ رقم تھا۔

شفق نہیں مغربی افق پر
یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوع فردا کا منتظر رہ کہ
دوش و امروز ہے فسانہ

بقیہ: خصوصی پروگرام

ہیں۔ ان علاقوں میں رہنے والے ہمارے رفقاء' عبدالرحمٰن ہنگورا صاحب اور عبدالقادر انصاری صاحب نے اپنے اپنے علاقوں میں ایسے وی سی آر مالکان سے بات کر کے مندرجہ ذیل علاقوں میں ماہ رمضان المبارک میں روزانہ بعد نماز عصر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے قرآن حکیم کے منتخب مقامات کے پینتالیس پینتالیس منٹ کے دروس قرآن نشر کروانے کا بندوبست کیا ہے۔

۱۔ ہنگورا آباد نئی کلری' لیاری کراچی۔

۲۔ گنو گلی میٹھادر کراچی

۶۔ روزانہ درس قرآن بعد نماز فجر۔

کراچی کے رفیق عابد جاوید صاحب کے ہاں ان کے ایکسیڈنٹ کے باوجود ہفتے وار دروس قرآن کا سلسلہ چل رہا ہے۔ یہ درس عابد جاوید صاحب خود دیتے ہیں۔ رمضان المبارک میں اب یہ درس ہفتہ وار کی بجائے روزانہ فجر کے بعد ہوا کرے گا۔ ان کے گھر کا پتہ یہ ہے۔

۱۱۔بی' اتحاد ٹاؤن' بلدیہ ٹاؤن' بسم اللہ چوک کراچی۔

بقیہ: پس منظر

ہوتا ہی نہیں' جب بھی ان کو طاقت میسر آتی ہے اپنے سے کمزور قوموں کو نیست و نابود کرنے کا بزدل اور ناپاک ارادہ لیکر ضرور اٹھتی ہیں۔ جس طرح جناب پران گپت نے اظہار ندامت کیا ہے اسی طرح بھارت کے صدر صاحب نے بھی یوپی کی صوبائی اسمبلی کو فوراً توڑ کر اور مذہبی اور فرقہ وارانہ جماعتوں پر پابندی لگا کر دہرا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف عالمی رائے عامہ کی نظروں میں سرخ رو ہونے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے کہ ہمارے ملک ہی کے صدر صاحب اور وزیراعظم صاحب نے اس معاملے پر ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور دوسری طرف انتہا پسند ہندو لیڈروں کو گرفتار کر کے ان کو تحفظ فراہم کیا اور مسلمانوں کو مزاحمت کا موقع نہ دیا۔ در اصل یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ بھارتی حکومت مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کرنا چاہتی ہے جو کچھ انہوں نے بدھ مت کے پیروکاروں کے ساتھ کیا یعنی "دیش نکالا"۔ اب یہ بات بھی ظاہر ہو چکی ہے کہ بھارت کی انتہا پسند ہندو تحریک راشٹریہ سیوک سنگھ (R.S.S) کے تیسرے اور حاضر گرو نے اپنے وفود اسپین بھیج کر یہ تحقیق کرائی ہے کہ مسلمانوں کو اسپین سے کس طرح نکالا گیا تھا۔ اصل میں راشٹریہ سیوک سنگھ (R.S.S) یہ جانتی ہے کہ مسلمان وہ ترنوالا نہیں جیسے بدھ مت کے پیرو تھے لہٰذا مسلمانوں پر بتدریج وار کر رہی ہے۔ تحریک راشٹریہ سیوک سنگھ وہ تحریک ہے جو علاقہ مشرقی پنجاب کی خاکسار تحریک کے مدمقابل انتہا پسند ہندوؤں نے تشکیل دی تھی اور وہی اس فساد کی جڑ ہے۔

مندرجہ بالا حقائق تحریر میں لانے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ آج بھارت میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ کوئی اتفاقی واقعہ یا حادثہ نہیں بلکہ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ ان کا پہلا شکار ہندوستان کے مسلمان دوسرے پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان ہیں کیونکہ پاکستان کو انہوں نے دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اب ہمیں اپنے طور طریقے بدلنے چاہئیں۔ ہندو ثقافت' مغربی ذہنیت' کمزور صوبائی قومیت کا پرچار اور کافرانہ جمہوری نظام حکومت کے جال سے نکل کر اپنے دینی فرائض' مذہبی روایات اور نظام خلافت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے ورنہ آج کل جو کچھ ہمارے معاشرے میں ہو رہا ہے اس کے نتائج صرف یہ ہوں گے کہ بھارتی مسلمانوں کے بعد پاکستان اور بنگلہ دیش کی حکومتیں اور مسلمان ہندو بالادستی اور توسیع پسندی کا نشانہ بنیں گے۔ (اللہ محفوظ رکھے)

بقیہ: اس ہفتے کا نامہ

دانشوروں کیلئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ کیا ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے یا اپنے خود ساختہ جذبات کی رو میں بہہ کر دشمنوں کو خوش کرنا ہے؟ اگر دشمن کو خوش کرنا ہے تو دشمن کشمیر' بوسنیا میں ہزاروں عصمت مآب خواتین کی عصمت دری کر کے' مسلمان بچوں کو زندہ اوون میں ڈال کر انہیں بھون کر بھی خوش نہیں ہوا تو اس کی منزل اسلام کا خاتمہ ہے' سوچو تم اپنے عمل سے کیا چاہتے ہو۔

خیراندیش بشیر احمد

بقیہ: افتتاحیہ

بھلے آزمودہ نظام ہائے حکومت کا حلیہ بگاڑ کے چھوڑا' کسی ایسے طرز حکومت کو کیا خاک چلائیں گے جس کی ترکیب میں ہی خرابی کی صورت مضمر ہے اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ہمیں مانگے تانگے کے اسلوب سیاست اور انداز حکومت راس آ ہی نہیں سکتے۔ ہم نے بہت غلط کیا جو اپنے وطن کو دنیا کے دوسرے سو ڈیڑھ سو ممالک پر قیاس کیا ہے کیونکہ جیسے خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ ویسے ہی خاص ہے ترکیب میں یہ ارض پاکستان بھی۔ برطانوی' امریکی' فرانسیسی یا کوئی بھی دوسرا نظام حکومت ہمارے نظریہ حیات سے ہی متصادم ہے' فٹبال میں ٹاٹ کا یہ پیوند اب تک بھلا نہیں لگا' آئندہ بھی کبھی خوش نہ آئے گا کیونکہ ہمیں نظام حکومت کی نہیں' نظام خلافت کی ضرورت ہے۔ محنت ہونی چاہئے تو اس تحقیق پر کہ چودہ صدیوں پیشتر جو ماڈل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست رہنمائی میں خلافت راشدہ نے بالفصل متشکل کر کے دکھایا تھا اس کے خدوخال آج کیا ہوں گے۔ ٹامک ٹوئیے مارتے ہم نے بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ کاش اب بھی ہم وقت کے تیور پہچانیں!○○

جب برف کی چادر اوڑھے دیو قامت پہاڑوں میں اقامت دین کی ندا گونجی

قافلۂ تنظیم اسلامی سرزمین رنگلہ میں

ناظم تنظیم اسلامی شمالی پنجاب جناب شمس الحق کا دورۂ کشمیر

رنگلہ راولپنڈی سے شمال مشرق میں بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ فروری میں عموماً یہ اور اس کے گرد و نواح کی پہاڑیاں برف کی سفید چادر اوڑھے ہوتی ہیں۔ لیکن اس سال خلاف معمول بہار کا سماں پیش کر رہی ہیں۔ چنانچہ پروگرام بنایا گیا کہ ۱۲ فروری بروز جمعہ تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام دفتر تنظیم اسلامی رنگلہ میں ایک جلسہ عام کا انعقاد ہو۔ محترم شمس الحق اعوان اور جناب خالد محمود عباسی کو ۱۱ فروری کو رنگلہ پہنچنا تھا اور چونکہ اگلے روز کے جلسہ کے لئے تیاریاں' ابتدائی تعارفی پروگرام مثلاً عمومی اعلان (اناؤنس منٹ) بھی اسی روز ترتیب دینا تھے لہٰذا دونوں حضرات ٹھیک ۱۰ بجے رنگلہ پہنچ گئے۔ محترم خالد محمود صاحب' راجہ اکرم صاحب اور راجہ تاج افسر خان صاحب اناؤنس منٹ کے لئے رنگلہ بازار' بیس رنگلہ' ملاٹ دھیر کوٹ چلے گئے۔ ۱۱ فروری کی شام کو مولاچھ میں درس قرآن کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا۔

۱۱ر فروری شام پانچ بجے یہ قافلہ مولاچھ کے لئے جو مرکزی دفتر رنگلہ سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے پیدل روانہ ہو گیا۔ مغرب کی نماز مسجد مولاچھ میں ادا کی گئی اور بعد از صلوۃ محترم شمس الحق اعوان صاحب نے سورۂ منافقون کی آخری آیات کا درس دیا ڈیڑھ گھنٹہ تک حاضرین نے اس قدر استغراق و انہماک کے ساتھ یہ درس سنا گویا شمس الحق اعوان صاحب کے سوا کسی کی موجودگی کا احساس تک نہ رہا۔ یہیں عشاء کی نماز ادا کی گئی اور پھر اگلی منزل یعنی راجہ تاج افسر صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے جہاں رات بسر کرنا تھی۔ مولاچھ مسجد میں درس قرآن کے دوران ہی راجہ عبدالوحید نائب ناظم تنظیم اسلامی آزاد کشمیر بھی مظفر آباد سے آکر اس قافلہ میں شامل ہو گئے۔

رات کے کھانے کے بعد تھکے ماندے اس قافلے کا ہر رکن جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا اور دوسری طرف موسم نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ تقریباً تین بجے شب گہرے سیاہ بادلوں نے پہاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تیز طوفانی ہوائیں گھن گھرج کے ساتھ در و دیوار کو جھنجھوڑتی ہوئیں اپنی موجودگی اور قہر و غضب کا احساس دلانے لگیں۔ انہی یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں میں ہی صبح چھ بجے صلوٰۃ فجر بھی قریبی مسجد میں ادا کی گئی۔ موسم کی اس تندی و تلخی میں جلسہ عام تو دور کی بات رہی' خود رنگلہ بازار پہنچنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ انسان کے پاس اس بیکسی و مجبوری کی کیفیت میں صرف دعائیں ہی تو رہ جاتی ہیں جنہیں صدق دل سے اور رقت والتجا کے لبادے میں لپیٹے ہوئے اپنے خدائے قادر مطلق کے حضور پیش کرنا' اس کا اکلوتا سہارا ہوتا ہے۔ چنانچہ دامن اظہار عجز و فریاد میں پھیلے اور دست طلب اٹھے اور قبول کرنے والے نے کچھ یوں قبول کیا کہ قدم مسجد سے باہر نکلے اور بادل چھٹنا شروع ہو گئے اور ماکولات صبح گاہی کے بعد تقریباً سات بجے جب یہ قافلہ رنگلہ کی جانب روانہ ہوا تو خورشید بادلوں کی اوٹ سے چہرہ باہر نکال کر اپنی سلطنت پر نگاہ متبسم ڈالتا ہوا ہمالہ کے چشموں کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کی کرنوں میں کھلتے ہوئے سبزے کا لباس پہنے اور سروں پر برف کی سفید سفید پگڑیاں باندھے' بلند و بالا دیو قامت پہاڑ داعیان حق کا استقبال کر رہے تھے۔ حد نگاہ تک وسیع و شاداب منظر میں یہ وجیہ اور وقیع سلسلہ کوہ باوقار اپنے بازوؤں کو پھیلائے ہوئے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی حد بندی کر رہا ہے۔ اسی کے پار خطہ زمین یعنی مقبوضہ کشمیر میں مسلمان اپنے "جرم محمدیؐ" کی پاداش میں بھارتی ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ان دلخراش مناظر کو دیکھ دیکھ کر یہ پہاڑ سکتے کی کیفیت میں آگئے ہیں۔ جیسے شدت حسرت و یاس میں پتھرائے ہوئے نگاہوں سے غرب و جنوب کی جانب دور افق پر کسی ابن قاسم کو ڈھونڈ رہے ہوں' جیسے کسی فضاء بدر کے متمنی ہوں۔

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جان

موسم اب تک مزید بہتر ہو چکا تھا اور اب پہاڑوں' دروں میں خیمہ ہائے سحاب بھی عید نظارہ تھے۔ دامن کوہ میں بکھری آبادی کے گھروں کی چمنیوں میں انگیٹھیوں سے نکلنے والے دھوئیں کا منظر گویا اٹھارویں صدی کے ریلوے انجنوں کے فضائی مشاہدے کا سا سماں باندھے ہوئے تھا۔ خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ اشجار کے درمیان جھاڑی کے سفید پھول بہار کی آمد کا اعلان کر رہے تھے۔ اسی منظر' اسی تر و تازہ فضا میں خراماں خراماں یہ قافلہ صبح آٹھ (۸) بجے رنگلہ آپہنچا کہ ابھی جلسہ کے لئے مختلف ذمہ داریاں سرانجام دینا باقی تھیں۔ بالآخر گیارہ بجے دن جلسے کا آغاز ہوا اور جناب خالد محمود عباسی نے تلاوت کلام پاک کی۔ اس کا ترجمہ اور تشریح فرمائی۔ راجہ محمد داؤد خاں نے تعارف تنظیم اسلامی کے زیر عنوان تقریر کی۔ اجلاس کے مہمان خصوصی شمس الحق اعوان اور صدر جلسہ حافظ چودھری الیاس تھے۔ شمس الحق اعوان صاحب نے تنظیم اسلامی' تحریک خلافت اور مراحل انقلاب کا عالمی حالات حاضرہ کے تناظر میں جائزہ کے ضمن میں سیر حاصل تقریر کی اور علاقہ کے عوام کی ایک کثیر تعداد پہلی مرتبہ کسی انقلابی جماعت کے منشور سے آگاہ ہوئی۔

اجلاس کی کارروائی ایک بجے اختتام کو پہنچی۔ نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد معاونین تحریک خلافت کا کنونشن بھی بلایا گیا اور مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوا۔ Convening کمیٹیاں تشکیل دی گئیں' ان کے فرائض نظامت راجہ محمد داؤد خاں کو سونپے گئے۔ مقامی حلقے اور کنوینگ کمیٹیوں کے ذمہ دار مندرجہ ذیل اصحاب کو بنایا گیا۔

۱۔ رنگلہ' راجہ منظور حسین خان صاحب۔ قاری ادریس صاحب
۲۔ رحیم کوٹ' حافظ عبدالحمید شاہد صاحب
۳۔ پریم کوٹ' خورشید احمد صاحب
۴۔ جاگیر کنیکر' محمد اکرم خان صاحب' حاجی راجہ گلزار خان صاحب
۵۔ اوچھاڑ' علی افسر خان صاحب' محمد انور احب
۶۔ باڑیاں' راجہ محمد رستم خان صاحب' راجہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

تراشے

اک دھماکہ ہوا اور یہ پوری کائنات عالم وجود میں آنے لگی

"کن فیکون" کیلئے جستجوئے ادراک

حال ہی میں سائنسی تجربات کے لئے مخصوص سیارے کے ذریعے حاصل کردہ معلومات سے اس نظریہ کو زبردست تقویت ملی ہے کہ ابتدا میں ایک زبردست دھماکہ ہوا جس سے اس کائنات کا آغاز ہوا اور بعض دوسرے نظریات کی نفی ہوئی ہے جن کی رو سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کئی ایک چھوٹے چھوٹے دھماکے اس کا سبب تھے۔

۷ر جنوری کو فونکس ۔ اریزونا' میں ماہرین فلکیات کی امریکی سوسائٹی کے ایک اجلاس کے دوران یہ انکشاف کیا گیا کہ کائنات سے متعلق حقائق معلوم کرنے کے لئے جو سیارہ' سی۔او۔بی۔ای' استعمال کیا گیا اس کی مدد سے پندرہ ہزار ملین سال قبل ہونے والے دھماکے 'بگ بینگ' جس سے اس کائنات کی تخلیق ہوئی' سے پیدا ہونے والی روشنی کی لہروں کی بالکل صحیح صحیح پیائش کی گئی ہے۔

اس سیارے کے ذریعے معلومات حاصل کرنے میں دس ماہ سے زائد عرصہ لگا اور اس طرح کئی سو ملین کی تعداد میں جو پیائشیں لی گئی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ ابتدائی دور میں روشنی کی شعاؤں سے کل جتنی توانائی حاصل ہوئی اس کا ننانوے اشاریہ ستانوے فیصد "بگ بینگ" سے متصلاً بعد ایک سال کے اندر اندر اخراج ہوا۔ روشنی سے پیدا ہونے والی توانائی روشنی ہی کی کسی نہ کسی شکل میں' یعنی "ایکس ریز" اور "گاما ریز" سے لے کر نظر آنے والی اور "انفرارڈ" شعاؤں بلکہ ریڈیائی لہروں تک' پیدا ہوتی ہے۔ سیارے میں جو آلات نصب کئے گئے انہیں "بگ بینگ" کے عرصہ تک ہر طرح کی باریک لہروں (مائیکرو ویو) اور انفرارڈ توانائی کی پیائش کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ کے نگران جان ماتھر' نے بتایا کہ "بگ بینگ" نظریہ پائیہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کائنات کی حقیقت جاننے کے لئے جو معلومات درکار تھیں سب حاصل کرلی گئی ہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے نہایت صحت کے ساتھ پرکھا گیا ہے۔

نظریاتی طور پر قدیمی شعاؤں سے جو قوس قزح بنے گی' وہ تاریکی کا مجموعہ ہوگی' سوائے اس کے کہ دھماکے کے ایک سال سے زائد عرصہ میں بہت زیادہ توانائی خارج ہوتی رہی ہو' کائنات کو اگر بالکل تاریک شے تصور کریں تو اس سے خارج ہونے والی روشن لہروں کا درجہ حرارت ہر جگہ ایک جیسا ہوگا۔ حالیہ تجربات سے پتہ چلا ہے کہ بعد میں کوئی توانائی خارج نہیں ہوئی۔ سی۔او۔پی۔ای کے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ "بگ بینگ" کے متصلاً بعد خارج ہونے والی توانائی کا درجہ حرارت "قطعی صفر" (قدرتی صفر سے ۲۷۳ درجے کم) سے دو اعشاریہ سات' دو' چھ درجے اوپر تھا جس میں اتار چڑھاؤ صرف صفر اعشاریہ صفر ایک درجے کا ہے۔

"ماتھر" کا کہنا ہے کہ ابتداً شدید گرم "بگ بینگ" کے باوجود جس قدر خنک روشنی بچ رہی تھی اسے بخوبی پیائش کیا جا سکتا ہے۔ ان تجربات کی رو سے بعد میں جو جھٹکے پیدا ہوئے وہ محدود نوعیت کے تھے۔ وہ کہتے ہیں جتنا ہم "بگ بینگ" کے قریبی دور کا مشاہدہ کرتے ہیں اتنی ہی صورت حال واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔

سی۔او۔بی۔ای' پر کام کرنے والے ماہرین نے گذشتہ اپریل میں ہی اپنی کامیابی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ سیارے کی مدد سے انہوں نے "بگ بینگ" سے شروع ہونے والی "باریک لہروں" (مائیکرو ویو) میں درجہ حرارت کے اس انتہائی معمولی اتار چڑھاؤ کا پتہ چلایا ہے جو کشش ثقل سے پیدا ہونے والے "ارتعاش" کو ظاہر کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے ہر شے جو ساکن تھی اس "ارتعاش" کی بدولت جنبش میں آئی اور بالآخر یہ ستارے' کہکشائیں اور کرے وجود میں آئے۔

"ماتھر" کا کہنا ہے کہ ان تجربات کی روشنی میں اب کائنات کے دوسرے رموز سے پردہ اٹھانے میں بھی مدد ملے گی۔ ان تمام نظریات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا جنکی رو سے "بلیک ہولز" سے بے پناہ توانائی کا اخراج' بڑے بڑے ستاروں میں شکست وریخت یا غیر متوازن اجزاء کی بوسیدگی کا عمل قرار پاتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں سب سے پہلے ایڈون ہبل نے "بگ بینگ" کا نظریہ پیش کیا تھا۔ جنہوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ زمین سے دوری پر واقع کہکشائیں ایک خاص رفتار سے مزید دور ہو رہی ہیں اور ان میں رفتار کا تناسب وہی ہے جو ان کے درمیان زمین سے فاصلے کا ہے یعنی جتنا ان کا زمین سے فاصلہ زیادہ ہے اتنی ہی زمین سے دور ہٹنے کی ان کی رفتار بھی زیادہ ہے۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ یہ پوری کائنات ایک ہی دھماکے سے وجود میں آئی ہے۔

تحریک خلافت پاکستان کا پہلا ملک گیر
کنونشن
ان شاءاللہ' یکم مئی ۹۳ء' بروز ہفتہ' صبح دس بجے
ملتان میں منعقد ہوگا۔
معاونین تحریک اور رفقاء تنظیم مع احباب شرکت کا اہتمام فرمائیں۔